سترہواں باب

اجنبی راستوں کے مسافر

مورخہ پانچ اگست:

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ اس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔ کمرے کی ایک کونے کی دیوار پر سجے اسلحوں کے نیچے رکھی میز پر ایک ڈائری اور کچھ صفحات بکھرے پڑے تھے۔ میز پر رکھے پیلے اسٹڈی بلب کی روشنی میں صفحات واضح تھے۔ ڈائری مکمل ہو چکی تھی، لیکن اسکی کہانی نہیں! لہٰذا وہ اب کورے صفحوں کا استعمال کر رہا تھا۔ آدھوں پر کام ہو چکا تھا اور آدھوں پر، وہ سیاہ لباس میں، نیم اندھیرے کمرے میں گم ہوتا وجود، جھکا ہوا بقایا کام مکمل کر رہا تھا۔ اُس نے صفحہ مکمل کر کے ایک مرتبہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکرایا۔

وہی دلفریب مسکراہٹ۔۔۔۔

مقابل کو مبہوت کر دینے والی۔۔۔

پھر اُس نے وہ صفحہ بقیہ صفحات کے اوپر رکھ دیا۔ اب وہ نیا صفحہ کھولے بقیہ کام مکمل کرنے لگا۔ میز کے پیلے بلب کی روشنی میں اُسکا تھوڑی دیر قبل مکمل کیا گیا صفحہ واضح ہو رہا تھا۔ اُسکی خوبصورت لکھائی میں لکھے الفاظ اب نظر آنے لگے تھے۔

اور پھر مئی کی تین تاریخ کو ایف آئی اے اُنہیں چھپتے چھپاتے شہر سے دور لے گئی۔ ایف آئی اے کہتی ہے کہ انہیں کوئی ایسا شخص نہیں ملا، جس نے اُن چھے لوگوں پر نظر رکھی ہو، وہ ٹھیک کہتی ہے۔ بھلا! میں کسی پر نظریں کیوں رکھواتا؟ جبکہ میں اُنکے سایوں سے بھی زیادہ اُنکے قریب تھا۔ میں ہر ہر لمحہ باخبر تھا۔ چاہتا تو کہہ دیتا، پر نہیں! ایسے تو کھیل میں مزا نہ آتا۔

تھوڑا اُن لوگوں کو مجھ سے چھپنے دو۔ تھوڑا اپنا دماغ چلانے دو، لیکن جتنا دماغ چلا لیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں جان سکتا کہ میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور کہاں سے اُنہیں دیکھ رہا ہوں؟ آہ۔۔۔۔ اس کھیل میں مزا بہت آیا تھا۔

پھر وہ لوگ پہنچ گئے۔ اپنی جان بچاتے، مجھ سے چھپتے چھپاتے وہ لوگ اُس پرانی حویلی پہنچ گئے۔

مجھ سے چھپتے۔۔۔آہ۔۔۔میں ہنسنا چاہتا ہوں۔

وہ مجھ سے چھپ رہے تھے۔جبکہ میں تو سب جانتا تھا۔پر کھیل جاری رہنے دیا کہ اصل مزا تو کھیلنے میں آرہا تھا۔

----------+---------+--------

ٹائر چرچرائے اور گاڑی جھٹکا کھا کر رک گئی۔رضا نے آنکھیں مل کر یہاں وہاں دیکھا۔اُسکے برابر والی نشست پر عمر پشت سے سر ٹکائے بے خبر سو رہا تھا۔علی سامنے والی نشست پر موبائل ہاتھوں میں لیے کچھ دیکھ رہا تھا۔رضا کو ہڑبڑا کر اُٹھتا دیکھ،اُس نے ذرا کی ذرا نظریں اُٹھا کر دیکھا،پھر دوبارہ اپنے سابقہ کام میں مشغول ہو گیا۔

مقدّم گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر اتر چکا تھا،اور ساتھ میں اُسکا بہترین دوست حسین بھی۔رضا نے ہاتھ میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔وہ لوگ تین روز سے مستقل سفر میں تھے۔اور آگے بھی سفر باقی تھا۔درمیان میں صرف ایک رات کے لیے اسلام آباد میں قیام کیا تھا۔

اُس نے ایک نظر علی کو دیکھا،پھر suv کا دروازہ کھول کر خود بھی باہر آگیا۔بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی۔

''ہمارا ڈرائیور کہاں ہے؟'' رضا نے اُن دونوں کے قریب آتے جمائی روکتے ہوئے پوچھا۔ایک طرف کھائی تھی،تو دوسری جانب دیو قامت پہاڑوں کے درمیان بنی سڑک کے کنارے،چھوٹے چھوٹے سے ڈھابے۔کرسیوں پر اکا دکا فیملیز کھانا کھاتے یا آرام کے عرض سے کچھ دیر قیام کرتی نظر آرہی تھیں۔تھوڑی دور بہت سی جیپ قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔رات کے اندھیرے میں پہاڑوں سے زیادہ خوفناک کوئی شے نہ لگتی تھی۔

''وہ ایس ایچ او غزنوی ہے۔ہمارا ڈرائیور نہیں!'' حسین نے تصحیح کی۔وہ لوگ جس غزنوی کو ایف آئی اے کے آفس میں سنجیدہ اور خاموش شخص سمجھے تھے،اُس شخص نے پورے راستے اپنا شجرہ نسب بتا کر انکا ٹھیک ٹھاک دماغ کھایا تھا۔بتانے کا مقصد فقط یہی تھا کہ میں ایک ایس ایچ او ہوں،ایسے ہی کسی کی ڈرائیوری کرنے نہیں آجاتا۔یہ تو کیس بہت اہم ہے اِس لئے یہاں ہوں۔ہونہہ! ڈرائیور نہ سمجھا جائے مجھے۔

''تو وہ ہے کہاں؟'' رضا نے سوال دہرایا۔

''سامنے چائے لینے گیا ہے۔'' مقدّم نے بتایا۔

''کیا ہم چائے پینے رکے ہیں؟'' اُس نے گاڑی سے ٹیک لگاتے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اچھنبے سے پوچھا۔ اُسکو اِس وقت یہاں، فقط چائے پینے کی غرض سے رکنے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔

''نہیں! ہمیں یہاں ایس ایس پی نوید عالم کا انتظار کرنا ہے۔ وہ کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔'' حسین نے کہا۔ نوید، بشریٰ کو گھر چھوڑنے کے بعد ایک اہم کام نمٹانے گیا تھا۔ اور پھر اُن سے تقریباً بھی نو گھنٹوں بعد وہ جگلوٹ کے لیے نکلا تھا۔ چونکہ اُس نے راستے میں کہیں قیام نہیں کیا تھا۔ لہٰذا وہ کچھ ہی دیر میں جگلوٹ پہنچنے والا تھا۔ یہاں سے آگے غزنوی کا کام ختم تھا۔

''تم نے اِس آدمی سے اتنی دیر گپ شپ کی، پر ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' حسین نے یکدم ہی مقدم سے پوچھا۔

''تمہیں میں بیوقوف لگتا ہوں؟'' وہ برا مان گیا۔ ''میں نے اُس سے دو چار راستوں کے متعلق پوچھا ہے، اور مجھے اُسی سے اندازہ ہوا ہے کہ ہماری منزل اسکردو کے آس پاس ہی ہے۔'' اُس نے بتایا، وہ یہاں کے راستوں کو زیادہ بہتر جانتا تھا۔

''آہ!۔۔۔ خدا کی قسم یہ غیر متوقع ٹور مجھے اس وقت قطعاً پسند نہیں آرہا ہے۔'' حسین نے کہا۔

''مجھے بھی۔۔۔'' رضا نے بھی بیزاری سے کہا۔ وہ لوگ مستقل سفر سے تنگ آ گئے تھے۔ اگلے ہی لمحے رضا کو ہلکا سا دھکا لگا تو وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔

''کیا ہے؟ دیکھ کر دروازہ نہیں کھول سکتے؟'' اُس نے بگڑ کر علی سے کہا، جس نے وہی دروازہ کھولا تھا، جس پر وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''تمہیں کھڑے ہونے کے لیے یہی جگہ ملی ہے؟'' وہ بھی دوبدو کہتا گاڑی سے باہر آیا۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' رضا بحث کو طول نہیں دینا چاہتا تھا، لہٰذا اپنا تکیہ کلام دہراتے ایک جانب ہو گیا۔

''میری طرف سے تم بھی۔'' علی بھی کہاں حساب رکھتا تھا؟

"خدارا! اِن دونوں میں سے کسی ایک کو تو کھائی سے نیچے پھینک دو۔تاکہ باقی راستہ کچھ سکون سے گزرے۔" مقدّم نے بیزاری سے درخواست کی تھی۔راستے بھر دونوں کسی نہ کسی بات پر ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے تھے۔وہ اب واقعی اُن دونوں سے تنگ آچکا تھا۔

"آنے دو ذرا ایس ایس پی کو! وہی دیکھے گا انہیں۔" حسین نے امّیوں کی طرح دھمکی دی۔

"کیوں؟ وہ باپ ہے ان دونوں کا؟" مقدّم کا سوال معقول تھا۔

"نوید آیا نہیں ویسے اب تک؟" اُن دونوں کی بکواس کو نظرانداز کرتے علی نے پوچھا تھا۔

"پوچھ رہے ہو یا بتا رہے ہو؟" حسین نے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آیا کیوں نہیں اب تک؟" اُس نے کہا۔

"وہ بڑے لوگ ہیں، کام ہوتے ہیں انہیں بہت۔ ہمارے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔" مقدم نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

"چائے آگئی آپ لوگوں کی۔" اتنے میں پیچھے سے غزنوی کی آواز آئی۔وہ ہاتھوں میں چائے کی دو پیالیاں پکڑے آرہا تھا۔جبکہ اسکے پیچھے ایک چھوٹا لڑکا بھی ساتھ ہی آرہا تھا، جس نے مزید چار پیالیاں ایک ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں۔

"شکریہ!" علی نے کہتے ہوئے ٹرے سے چائے کی ایک پیالی اٹھالی۔

"آگے کہاں کا قصد ہے اب؟" سوال حسین کی طرف سے آیا تھا۔

"یہ تو نوید سر ہی بتائیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے؟" غزنوی نے چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں؟ تمہیں آگے کا رستہ نہیں معلوم؟" رضا نے پوچھا۔

"معلوم ہے، پر مجھے اجازت نہیں ہے آپکو بتانے کی۔" اُس نے سکون سے کہا۔

"حد ہے! اب تو مجھے خود اپنا آپ ہی مجرم لگ رہا ہے۔" علی نے کہا تھا۔اس بات پر رضا کے منہ میں کوئی بڑا ہی زبردست قسم کا جواب آیا تھا، پر وہ خاموش رہا۔

''یہاں سے آگے دو راستے ہیں اور دونوں اسکر دو جاتے ہیں۔ اگر سیدھا اور عام روٹ لیا جائے تو ہم چلاس سے جائیں گے۔ دوسرا راستہ دشوار اور لمبا ہے۔ میرے خیال سے ہم بذریعہ چلاس ہی اسکر دو جائیں گے۔''مقدّم نے اندازہ لگایا، غزنوی اِس بات پر خاموش ہی رہا تھا۔

''میں بھول گیا تھا کہ تمہارا آبائی گھر سوات میں ہے۔ یاد دلانے کے لیے شکریہ!''علی نے کہا تو وہ ہنسا۔

''عمر کدھر ہے؟''اُس کو اچانک ہی عمر کی کمی محسوس ہوئی تو پوچھا۔

''سو رہا ہے۔''علی نے بتایا۔

''ابھی تک؟''اُسے حیرت ہوئی، کیونکہ گاڑی رکنے کے بعد سب ہی جاگ گئے تھے۔

''وہ کل رات سے سویا نہیں ہے شاید! کل اسلام آباد میں بھی میں نے اُسے ساری رات گیسٹ ہاؤس کے لیوینگ روم میں بیٹھے دیکھا تھا۔ پھر جب میں صبح اٹھا تو وہ تب بھی وہیں تھا۔''اِس بات پر سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا تھا۔ جان تو سب ہی گئے تھے اُسکی بیماری کے بارے میں، لہذا کچھ کچھ پریشانی نے آگھیرا تھا۔

''پریشانی کی بات نہیں ہے، بعض اوقات نئی جگہ نیند نہیں آتی ہے تو ایسا ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ طویل سفر کی وجہ سے بھی دماغ متحرک ہو جاتا ہے اور تھکن کے باوجود بھی نیند نہیں آتی۔''یہ جواب غزنوی نے دیا تھا۔ اُسکے بعد بھی وہاں کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''کیا ہمیں اب بھی کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''حسین نے اچانک ہی پوچھا۔

''نہیں! آپ منزل پر پہنچنے تک اپنے موبائل کو ایئر پلین موڈ سے ہٹا نہیں سکتے۔ آپکی لوکیشن ٹریس کی جا سکتی ہے۔ احتیاط لازم ہے۔''اِس بات پر اُسکا منہ بنا تھا۔ فرّخ صاحب کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ سب اپنے لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ وغیرہ ساتھ رکھ کے لائے تھے۔ اُسی لمحے قریب ایک جیپ آکر رکی تو سب کی توجہ اسی جانب گئی۔ جیپ میں سے سیاہ جینز پر سفید ٹی شرٹ پہنے، اور اُس پر سیاہ لیدر کا جیکٹ ڈالے نوید اُترا تھا۔ سیاہ بالوں کے درمیان ہلکے سفید و سرمئی بال اندھیرا ہونے کے باوجود، اُسکی وجاہت میں اضافہ کر رہے تھے۔ جینز کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اُنہی کے پاس آ رہا تھا۔ وہ اُن سے نو گھنٹے بعد سفر شروع کرنے کے باوجود بھی اُن تک جلدی پہنچ گیا تھا، یقیناً اُس نے راستے میں قیام نہیں کیا تھا۔

''تمہارا کام مکمل ہو گیا ہے، تم جا سکتے ہو۔'' سلام نہ دعا، آتے ساتھ ہی چائے پیتے غزنوی کو مخاطب کیا تھا۔ علی نے تاسف سے اُسے دیکھا۔

بداخلاق، بدلحاظ، بے مروت آدمی!

''جی سر! بس آپکا ہی انتظار تھا۔ جیپ والوں سے میں نے بات نہیں کی ہے۔ آپ خود دیکھیں گے یا میں کسی کو راضی کروں؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں! میں دیکھ لوں گا۔'' اُس نے کہا۔

''عمر کہاں ہے؟'' نوید نے رک کر ایک نظر سب کو دیکھا، اور عمر کو سب کے درمیان موجود نہ پا کر پوچھا۔

''گاڑی میں ہی ہے، سو رہا ہے شاید!'' علی نے بتایا۔

''اُسے جگا دو، ہم آگے کا سفر شروع کریں گے، غزنوی واپس جائیگا، باقی لوگ اپنا سامان نکال لیں، جب تک میں جیپ والوں سے بات کرتا ہوں۔'' اُس نے کہا تو وہ لوگ سر ہلاتے گاڑی کی جانب بڑھے۔

''سر! جیپ راضی کرنا مشکل ہے۔'' غزنوی نے اُسکے کان کے پاس آکر سرگوشی کی۔

''یہ میرا مسئلہ ہے۔'' اُسکا جواب دوٹوک تھا۔

''اُٹھو عمر! ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔'' گاڑی کا دروازہ کھول کر علی نے عمر کا کندھا ہلایا پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''تم جیپ کیوں لے رہے ہو؟ ہم suv سے بھی جا سکتے ہیں، چلاس کا راستہ بہتر ہے۔'' دوسری جانب مقدّم کچھ مشکوک نظروں سے نوید کو دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

''ہم چلاس نہیں! استور جا رہے ہیں۔'' یہ پہلی بار تھا، جب نوید نے کسی بات کا مکمل جواب دیا تھا۔ مقدّم کا تو مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا۔ جبکہ نوید اُسے سراپا حیرت چھوڑے آگے بڑھ گیا۔

''استور یعنی؟'' وہ استور کا مطلب بہت اچھے سے جانتا تھا۔ فوراً اُسکے پیچھے لپکا۔

''عمر!''علی نے دوبارہ عمر کا کندھا ہلایا پر وہ اب بھی نہ ہلا تو اُس نے پریشان ہو کر برابر میں کھڑے، اپنا سامان نکالتے رضا کو دیکھا۔ وہ بھی چہرے پر تشویش لیے آگے آیا۔

''کیا ہوا اسے؟''اُس نے علی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں! اُٹھ نہیں رہا۔''علی نے پریشانی سے کہا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ حسین کہیں سے نمودار ہوا، اور علی کو پیچھے ہٹاتے عمر کو تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔

''اُٹھ جاؤ بھائی! کونسا نشہ کر کے سوئے ہو؟''اِس سے پہلے کہ اُسکی اِس حرکت پر رضا اُسے دو تھپڑ رسید کرتا، عمر نے مندی مندی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ سرخ آنکھیں اُسکی گہری نیند سے جاگنے کا پتہ دے رہی تھیں۔ رضا سر جھٹک کر واپس اپنا سامان نکالنے چلا گیا، علی نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ ڈرا ہی دیا تھا اِس نے تو!

''کیا ہے حسین؟ سکون نہیں ہے تمہاری زندگی میں؟''آنکھوں پر بازو ٹکاتے عمر نے پہلی بار چڑچڑے پن سے کہا تھا۔

''سکون تو اب کسی کی بھی زندگی میں نہیں ہے۔ ہم دوسری گاڑی میں شفٹ کر رہے ہیں، اٹھ جاؤ جلدی!''حسین نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر تقریباً زبردستی بٹھایا تو جیسے اُسکا دماغ جاگا۔

''استور؟ تم استور جانے کی بات کر رہے ہو؟ اِس وقت؟ کیا استور ہماری منزل ہے؟''دوسری جانب مقدّم تیزی سے نوید کے پیچھے آیا تھا۔

''نہیں! استور ہماری منزل نہیں ہے، ہم آگے جائیں گے۔''جیبوں میں ہاتھ ڈالے نوید بھی آج بڑی فرصت سے جواب دے رہا تھا۔ رات کے اِس پہر سردی رگ وپے میں سرایت کر رہی تھی۔ دونوں کا رخ قطار میں کھڑی جیپوں کی طرف تھا۔

''اُس سے آگے یعنی چلّم چوکی؟''اُس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''ہاں!''نوید نے سر اثبات میں ہلایا۔

''اور اُس سے آگے دیوسائی؟''اُس نے تصدیق چاہی۔

''بالکل!''نوید نے تصدیق کر دی۔

''پھر اسکردو؟''اُس کو اپنے سوال پر خود بھی یقین نہ تھا۔

''ہاں! ہماری آخری منزل!''اُس نے اِس بات بھی سکون سے جواب دیا تو وہ اُسے بے یقینی سے دیکھتا رہ گیا۔

''میں تمہارا سامان اُتار دیتا ہوں۔''عمر کو آنکھیں ملتے، گاڑی سے باہر نکلتے دیکھ کر رضا نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''نہیں! میں کر لوں گا۔ تمہارا شکریہ!''اُس نے مختصر جواب دیا۔ آواز بھاری تھی، جیسے فلو ہو رہا ہو۔ رضا خاموش ہو کر ایک جانب ہٹ گیا تاکہ وہ اپنا سامان اُتار لے۔

''تم پاگل ہو کیا؟ تمہیں اسکردو جانے کے لیے یہی راستہ ملا ہے؟''مقدّم بیساختہ چیخا، اُسکی آواز اِس قدر بلند ضرور تھی کہ suv کے پاس کھڑے باقی چاروں نے مڑ کر اُسے دیکھا۔

''آسان راستے پر کوئی بھی پیچھا کر سکتا ہے۔ یہ راستہ محفوظ ہے۔''نوید کو پہلے کب فرق پڑا تھا جواب پڑتا۔ باقی چاروں کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کی کیفیت میں اپنا اپنا سامان لیکر اُنکے قریب پہنچنے لگے۔

''محفوظ؟ وہ سب سے خطرناک، دشوار اور سب سے غیر محفوظ راستہ ہے۔ اوپر سے تم رات کے وقت سفر کرنے کی بات کر رہے ہو؟ ہمیں مارنے کا پلان بنایا ہے کیا؟''اس بات پر نوید بیساختہ ہنسا تھا۔

وہ واقعی بیساختہ ہنسی تھی۔۔۔۔فقط چند سیکنڈ کی۔

پر لمحوں کو سب رک گئے۔ وہ ہنسا تھا؟ وہ واقعی ہنسا تھا؟ بالآخر دس سالوں بعد نوید عالم بیساختہ ہنسا تھا۔ اُسکی ہنسی دلکش تھی، دلفریب سی، مبہوت کر دینے والی۔

پر سوال یہ تھا کہ اتنی سخت صورتحال میں وہ کیوں ہنسا تھا؟ ایسا کوئی لطیفہ نہیں سنایا تھا مقدّم نے اُسے۔ پل بھر کی ہنسی، نوید نے پل بھر میں غائب بھی کر دی، کہ وہ اِس میں ماہر تھا۔

''میں تمہیں سیدھے راستے سے لے جاؤں، پر وہاں بھی کوئی تمہیں مارنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہو سکتا ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر تمہیں جانا ہے تو دن کے وقت چلو نوید! رات کے وقت ان راستوں پر سفر کرنا خطرناک ہے۔''مقدم ان راستوں کو اُس سے کئی گنا بہتر جانتا تھا۔ باقی سب تو بس خاموشی سے دونوں کو بحث کرتا دیکھ رہے تھے۔

''ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے، اور نہ رکنے کے لیے کوئی جگہ!''اُس نے سنجیدہ مگر سخت لہجے میں کہا۔

''کوئی جیپ والا اِس وقت جانے کو راضی نہیں ہو گا۔''مقدّم نے کہا اور جا کر پہاڑ کی پتھریلی سطح سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا جیسے کہہ رہا ہو جاؤ جو کرنا ہے کرو!

''جیپ والے کو تم راضی کرو!''وہ بھی مقدّم کے برابر ٹیک لگائے سکون سے حکم صادر کرتا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، پھر لب بھینچے۔

''میں تمھارا نوکر ہوں؟''اُس نے تپے لہجے میں سوال کیا۔ اتنی دیر میں نوید جیب سے لائٹر نکال چکا تھا، کیوں؟ یہ یقیناً اُسے ہی معلوم تھا۔

''زیادہ منّتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ مانے تو دو تھپڑ لگا کر راضی کر لینا۔''وہ اپنی مرضی کے جواب دیتا تھا، سو اب بھی وہی کیا۔

''ہر مسئلہ مار پیٹ سے حل نہیں ہوتا، تمیز اور اخلاق سے بھی بات کی جا سکتی ہے۔''حسین کو اُسکی بات بری لگی تھی۔ مار دھاڑ کے سوا آتا ہی کیا تھا اِس آدمی کو؟

''جاؤ کر لو تمیز سے بات۔''اس نے سکون سے کہتے دوسری جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور لبوں سے لگا لی۔ نوید اور سگریٹ؟ سب نے حیرت سے منہ کھولے اُسے دیکھا۔ آج تو وہ ایک کے بعد ایک عملی انکشافات کر رہا تھا۔

''چلو مقدّم! ہم جیپ والوں سے بات کرتے ہیں۔''حسین اُسے کھینچتا ہوا ساتھ لے گیا۔ رضا نے اُسے سگریٹ پیتے دیکھا تو یکدم ہی اپنے اندر بھی سگریٹ کی شدید طلب محسوس کی۔ بیگ ایک جانب رکھ کر وہ بھی پتھریلی سطح سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا اور جیب سے سگریٹ نکال لی۔ نوید نے بنا کچھ کہے اپنا لائٹر اُسکی جانب بڑھا دیا، جسے اُس نے تھام لیا، پھر سگریٹ جلا کر فضا میں دھواں چھوڑا۔ عمر نے تاسف سے دونوں کو دیکھا، پھر تیسرے شخص علی کو! جسکے چہرے پر واضح لکھا تھا کہ وہ بھی اس محفل کا حصّہ بننا چاہتا تو ہے، پر فلحال خود کو باز رکھے

ہوئے ہے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ علی ٹھیک ٹھاک قسم کا سموکر ہے، دن بھر میں، آٹھ دس تو وہ چلتے پھرتے پھونک دیا کرتا تھا۔ پر اِس وقت وہ کیوں سگریٹ نہیں پی رہا؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ حالانکہ موقع بھی تھا اور دستور بھی۔۔۔

رضا کو اُس نے پہلے بھی سگریٹ پیتے دیکھا تھا، پر نوید جیسے بہترین فزیک کے انسان سے اُسے یہ امید نہ تھی۔ اُس نے ایک بار پھر افسوس سے اُن تینوں کو دیکھا۔ اُسکی نفاست پسند طبیعت کو اس خراب شے کی بو سخت گراں گزرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا شوق تھا اُنہیں اپنی صحت سے کھیلنے کا؟

"السلام علیکم بھائی! ہمیں ذرا اسکردو تک جانا ہے۔" مقدّم نے قطار میں لگی جیپوں میں سے ایک جیپ کے اندر لیٹے ڈرائیور کو دیکھ کر کہا۔

"لے جائیں گے۔" اُس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"بذریعہ استور!" اُس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"لے جائیں گے وہاں بھی، پر ذرا صبح ہو جانے دو۔" اُس نے کہا۔

"نہیں بھائی! ہمیں ابھی ہی جانا ہے۔" حسین نے کہا۔

"تو چلاس کے راستے لے جاتے ہیں۔" اُس نے کہا۔

"نہیں نہیں! ہمیں استور سے ہی جانا ہے۔" اب کہ ڈرائیور نے سرتاپاؤں اُسے گھورا۔

"تمہارے جیسے بہت سر پھرے آتے ہیں، ایڈونچر کے شوقین ہوتے ہیں۔ پھر خوامخواہ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور ہمارا بھی۔ جاؤ لالہ! فضول میں دماغ نہ کھاؤ! جا کر کوئی اور ڈھونڈ لو جو رات کو اسکردو لیجانے پر راضی ہو جائے۔ وہ بھی استور سے۔" اُس نے ہاتھ جھلاتے کہا اور واپس اپنی سابقہ پوزیشن میں لیٹ گیا۔ اُسکے بعد مقدّم اور حسین نے تقریباً ہر جیپ والے سے بات کی، پر رات کے وقت کوئی بھی استور سے جانے کو راضی نہ تھا۔ بالآخر دونوں فاتحین واپس لوٹے۔

"دیکھا! میں نے کہا تھا کہ کوئی نہیں جائے گا۔" مقدّم نے فخر سے ٹیلے کے پاس کھڑے نوید کو دیکھ کر کہا۔

’’پہلے بتانا تھا، suv واپس بھیج دی ہے۔ اب تو ہم رات بھی یہاں نہیں گزار سکتے۔‘‘ نوید نے سگریٹ منہ سے نکالتے دھواں فضا میں چھوڑتے کہا، عمر ناگواری سے اُن دونوں کو دیکھتا وہاں سے دور ہٹ گیا۔ اِس جواب پر مقدّم نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا تھا۔

’’تم پاگل ہو؟ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہم نہیں جا سکتے پر تم بضد تھے، suv کو بھیجنے سے پہلے کم از کم میرے واپس آنے کا انتظار کر لیتے، اب ہم کہاں انتظار کریں گے؟ وہ بھی اِس سامان کے ساتھ؟‘‘ اس لہجے پر نوید نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔

’’کہاں جانا ہے تم کو؟ ہم کو بتاؤ! ہم لیکر جائیگا تم کو۔‘‘ اُن سب نے مڑ کر دیکھا تو جس جیپ میں نوید یہاں تک آیا، وہی جیپ والا پیچھے کھڑا تھا۔

’’تم گئے نہیں؟‘‘ نوید نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

’’نہیں! بنا سواری کے خالی جیپ لیجاتا کیا؟ اپنا نقصان کر لیتا ہم؟‘‘ وہ ناراض ہوا۔

’’تو تم استور چلو گے؟‘‘ نوید نے اسکردو کا ذکر نہیں کیا۔

’’لے جائے گا، پر پیسہ زیادہ لگے گا۔‘‘

’’کتنے؟‘‘ نوید نے پوچھا۔

’’بیس ہزار!‘‘ اِس بات پر مقدّم ہنسا۔

’’تمہیں ہم پاگل دکھتے ہیں؟‘‘ مقدّم نے پوچھا۔

’’پاگل ہی تو ہے تم! اتنا رات کو کون جاتا ہے استور؟‘‘ وہ صاف گوئی سے بولا۔

’’دیکھیں! ہمارا جانا ضروری ہے۔ آپ بہت زیادہ قیمت مانگ رہے ہیں۔‘‘ پہلی بار عمر نے حصّہ لیا تھا۔ وہ اِس بلاوجہ کی بحث سے تنگ آ رہا تھا۔ نوید بڑی فرصت سے ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے، اُنکی گفتگو ملاحظہ کرتا سگریٹ کا دھواں سارے میں چھوڑ رہا تھا۔

’’بیس ہزار سے ایک روپیہ کم نہیں لے گا۔‘‘ وہ اڑ گیا۔

''اتنے میں تو دو جیپ بک کر لوں گا میں۔'' مقدّم نے کہا۔

''تو کر لو! ویسے بھی تم چھے لوگ اور سامان بھی ساتھ ہے۔''

''اس جیپ میں بعض دفعہ آٹھ لوگ بھی آتے ہیں، بلکہ تمہاری والی سیون سیٹر ہے،اِس میں تو ہم سوات میں دس بیٹھ جایا کرتے ہیں۔'' وہ بھی ڈٹ گیا۔

''بھائی جان! ہم نے تم کو اپنا قیمت بتا دیا ہے۔ رات کے وقت استور اتنے میں ہی جائے گا ہم۔ اور بس!'' وہ صرف استور کے بیس ہزار مانگ رہا تھا،اِس سے آگے چلّم اور دیو سائی کی تو ابھی بات ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی زیادہ قیمت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

''یار! تم تو ہمارے پٹھان بھائی ہو، ایسا کرو گے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ؟'' حسین نے ذرا الجاجت سے کہا۔

''کون سا وطن کی بات کرتا ہے تم؟ کون پٹھان ہے ادھر؟ ہم افغانی ہے افغانی۔۔۔ ہمارا وطن بھی افغانستان ہے۔ ہمارا طرف سے یہ وطن اور اسکا لوگ، سب بھاڑ میں جائے۔'' اگلے ہی لمحے نوید سگریٹ پھینکتا ہوا اُٹھا اور بنا کسی کو بھی سوچنے کا موقع دیئے،اُس نے ڈرائیور کا ہاتھ پکڑ کر موڑا اور اُسکی کمر پر بند کرتے ہوئے،اُسکا سر جیپ کے بونٹ پر پٹخ دیا۔ اس اچانک افتاد پر تو وہ بوکھلا گیا۔

''کیا بکواس کی تم نے؟'' اُسکے لہجے میں جو جلال تھا،اُس پر وہاں کھڑے ہر شخص کو سانپ سونگھا تھا۔

''بھائی! ارے! ہم مذاق کر رہا تھا۔۔۔ ہم جاتا ہے ناں! تم جہاں بولے گا، وہاں جائے گا۔'' وہ فوراً لائن پر آیا تھا۔

''پہلے جواب دو بکواس کیا کی ہے تم نے ابھی؟'' اُسکا دماغ ٹھیک ٹھاک گھوما تھا۔

''معاف کر دے بھائی جان! ہمارا تو یہ جواب ایسا کچھ بولے۔'' اُس نے منت کی۔

''چھوڑ دو نوید اُسکو!'' عمر نے اُس سے التجا کی تو اُس نے جھٹکے سے اُسے چھوڑا۔

''چلو! جیپ اسٹارٹ کرو فوراً۔'' نوید نے بیلٹ میں لگی پسٹل نکالتے کہا اور اُسے سامنے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر تو وہ سیدھی شرافت سے مان گیا۔ صحیح کہہ رہا تھا وہ، بعض دفعہ دو تھپڑ لگانے کے بعد ہی بات بنتی ہے۔

وہ لوگ جب اپنا سامان جیپ میں لوڈ کر رہے تھے، تب ڈرائیور نظریں بچا کر عمر کے پاس آیا۔

''سنو ہمارا بھائی! تم ہمارا ساتھ آگے بیٹھ جانا۔''اُس نے عمر سے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا، غالباً وہ نوید سے ٹھیک ٹھاک ڈر گیا تھا۔

تمام سامان لوڈ ہونے کے بعد وہ لوگ اللہ کا نام لیکر جیپ میں بیٹھنے لگے۔

''عمر!''نوید نے عمر کو آگے والی نشست کی جانب بڑھتا دیکھ کر پکارا۔

''ہاں!''اُس نے رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔''اِس بات پر اُس نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے ڈرائیور کو دیکھا، جسکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

----------+---------+--------

''پہنچ گئے استور، چلو اب ہمارا پیسہ دو اور اترو!''رات کے نجانے کس پہر اُس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا تھا۔

''تم سے گاڑی روکنے کو کہا؟''نوید نے اُسے سنجیدگی سے گھورا۔

''لالہ! تم ہی تو بولا تھا کہ استور جانا ہے، اب پہنچ تو گیا ہے۔ تو اب اُترو!''اُس نے حیرت سے کہا۔ پیچھے والوں کی تو سانسیں، سماعتیں، آوازیں سب بند تھیں۔ رات کے اِس جامد سناٹے اور اندھیرے میں، ان خطرناک راستوں پر سفر نے اُنکی ہوائیاں اڑائی ہوئی تھیں۔

''گاڑی چلاؤ! ہم چلّم جائیں گے۔''نوید نے اُسکے سر پر بم پھوڑا تھا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

''چلّم؟ تم چلّم بولتا ہے؟''اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''ہاں!''نوید نے سر ہلایا۔

''بات سنو بھائی جان! ہمارا دماغ خراب نہیں ہوا ہے ابھی! تم کو جانا ہے تم جاؤ!''وہ صاف مکر گیا۔

''پھر سے بولنا ذرا!''نوید کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ اُسکی ساری ہمت ہوا ہوئی۔

''لالہ! تم ہم کو بیس ہزار میں استور آنے کا بولا تھا صرف!'' وہ منمنایا۔

''پیسے مل جائیں گے۔''نوید نے گویا یقین دلایا۔

''بات صرف پیسوں کا نہیں ہے۔''اُس نے کہا۔

''پھر؟''

''اصل میں ہم کو ابھی نیند آرہا ہے۔اور ہم نیند میں گاڑی نہیں چلا سکتا۔''

''چلّم پہنچ جائیں پھر سو جانا۔''نوید نے کہا۔

''پر ہم کو تو ابھی نیند آرہا ہے نا۔''

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، نیند میں کس طرح گاڑی چلائے گا؟ ویسے ہی اتنا خطرناک راستہ ہے۔خدانخواستہ! کوئی حادثہ ہو گیا تو؟''عمر نے پہلی بار تائید کی۔

''تو ہم یہاں سڑک پر اسکے سونے اور جاگنے کا انتظار کریں گے؟''سوال حسین نے کیا تھا۔

''نہیں! ہم انتظار نہیں کر سکتے، چلّم پہنچنے تک تو ہرگز نہیں!''نوید سنجیدہ تھا۔

''نوید ٹھیک کہہ رہا ہے۔یہ جگہ رکنے لائق نہیں ہے۔''مقدّم نے کہا تو سب نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، اِس حد تک گہرا اندھیرا تھا،اُس پر سے ہزاروں فٹ گہری کھائی پر مشتمل کچی سڑک، جس پر صرف جیپ کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ہی کچھ سمجھ آجاتا تھا۔اُنکے علاوہ یہاں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد، رضا کو تو باقاعدہ خوف آرہا تھا۔باقیوں کے علاوہ یہ صرف اُسکا شمالی علاقہ جات کی طرف پہلا سفر تھا۔اُسکو پہاڑوں کا دن میں کوئی تجربہ نہ تھا، کجا کہ رات کو۔ایسے میں جب ایک دو بار سامنے سے کسی دوسری جیپ کی کراسنگ ہوئی تو اس نے تو فاتحہ ہی پڑھ لی تھی۔

''پر نوید! یہ کہہ رہا ہے کہ اِسے نیند آرہی ہے۔ایسے میں ڈرائیو کروانا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔''علی نے خدشہ ظاہر کیا۔

''دیکھو کتنا صحیح بولتا ہے یہ بھائی! اور یہ اِسے کیا ہوتا ہے؟ راشد خان نام ہے ہمارا!''راشد صاحب علی کو اپنا ہمنوا پاکر خوش ہوئے۔

''چلّم زیادہ دور نہیں ہے،اور اتنی بھی کوئی نیند نہیں آرہی اِسے۔اب وقت برباد کرنے کے بجائے گاڑی چلاؤ۔''نوید نے پہلے علی کو اور پھر راشد کی مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اُس نے منہ بناتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

''ایک منٹ رکو! ہمارا بھتیجا ہے یہاں، اُسکو بھی ساتھ لینا ہے۔''اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے کسی کو بھی سوچنے کا موقع دیئے بنادروازہ کھولا اور اتر گیا۔

''کہاں جارہے ہو؟''نوید پیچھے سے چیخا۔

''صبر!''اُس نے دور سے کہا،اندھیرے میں وہ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ پھر پانچ منٹ بعد اُسکی واپسی ہوئی تو ساتھ پانچ چھے سال کا بچہ بھی تھا۔

''یہ کون ہے؟''نوید نے پوچھا۔

''ابھی تو بتایا، ہمارا بھتیجا ہے۔''اُس نے بچے کو زبردستی نوید کے برابر میں بٹھادیا۔ پھر گاڑی چلادی۔ اُنہیں سمجھ نہیں آیا کہ اُسکا بھتیجا اچانک کہاں سے نمودار ہوا تھا؟ پر خاموش رہے کہ اُسکی حرکتیں ویسے بھی نہ سمجھ میں آنے والی ہی تھیں۔کچھ دیر خاموشی سے سرکے۔

گھونگھٹ کی آڑ سے دلبر کا

دیدار ادھورا رہتا ہے۔۔۔

بیچ راستے میں اچانک ہی راشد نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ تمام کے تمام افراد نے اس بے وقت کے کنسرٹ پر حیرت واچھنبے سے پہلے اُسے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

جب تک نہ پڑے عاشق کی نظر

سنگھار ادھورا رہتا ہے

اب کہ راشد، موسیقار کے ساتھ خود بھی چلا چلا کر گا رہا تھا۔ نوید نے پہلے سخت کوفت سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا،(گویا خود کو شدید طیش میں آنے سے باز رکھا) پھر غصّے سے ہاتھ مار کر کیسٹ پلیئر بند کر دیا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟ ہم گانا سن رہا تھا۔''وہ سخت ناراض ہوا۔

''کیوں تمہارا ولیمہ ہے؟''نوید کی بس ہو گئی تھی۔اتنا اُسے زندگی میں کسی نے تنگ نہیں کیا تھا، جتنا اِس شخص نے چند گھنٹوں میں کر دیا تھا۔

''توبہ توبہ! ہم کو ایسا گنہگار سمجھ رکھا ہے کیا؟ چار شادیاں کر چکا ہے ہم، اب کونسا ولیمہ؟''اُس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''میری بات سنو! اپنی بکواس اور یہ کیسٹ بند کر کے گاڑی چلاؤ!''نوید کی آواز بلند ہوئی۔

''لالہ! ہم نہیں جائیگا تمہارا ساتھ۔ بہت ہو گیا!''اُس نے بھی غصّے سے کہتے گاڑی روک دی۔

''کیا ہے یار!''اب کہ سب ہی بیزار ہوئے تھے۔

''میری بات سنو! میں تمہارے کسی قسم کے نخرے برداشت نہیں کروں گا۔ چپ کر کے جیپ اسٹارٹ کرو، ورنہ بہت برا ہو جائیگا اب۔''نوید کا صبر جواب دے چکا تھا، لہٰذا اُسے دھمکایا۔

''تم کیا ہمارا شوہر ہے جو ہم تم کو نخرے دکھائے گا۔''اب کہ وہ بھی ناراض ہو گیا۔ پیچھے بیٹھے افراد نے اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''لاحول ولا قوۃ!''نوید بڑبڑایا، پھر اُسے غصّے سے گھورا۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ بالکل انسان بن کر جیپ چلاؤ! ورنہ۔۔۔''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ اب نرمی نہیں کروں گا تمہارے ساتھ۔''اُسکی دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ منہ بناتے ہوئے گاڑی چلانے لگا۔ کچھ دیر جیپ میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر علی کو ایسا محسوس ہوا جیسے راشد کو واقعی نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔

''مقی سنو!''اُس نے مقدّم کا کندھا ہلاتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''کیا؟''اُس نے بھی آہستہ سے پوچھا۔ صورتحال اتنی کشیدہ تھی کہ وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ علی نے اُسے دس سالوں بعد اُسکے، اُسی نام سے مخاطب کیا ہے، جو کسی زمانے میں یار دوستوں نے مل کر رکھا تھا۔

''مجھے لگ رہا ہے،اِسکو واقعی نیند آرہی ہے۔'' اُس نے کہا تو مقدّم نے بغور راشد کو دیکھا۔

''مجھے نہیں لگتا۔ یہ لوگ بیس بیس گھنٹے بنا سوئے گاڑی چلا لیتے ہیں،انکو عادت ہے۔ کبھی کبھار نیند کے جھونکے آ ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی چلّم زیادہ دور نہیں رہ گیا۔''اُس نے علی سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

''اور اگر اِسکے بیس گھنٹے پورے ہو گئے ہوں تو؟''رضا نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لیا۔ سوال اُسکا معقول تھا، مقدم جواباً خاموش رہا۔

''مجھے رات کے اِس وقت،ان سڑکوں پر سفر کرنا ویسے ہی صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ اتنا کچا راستہ ہے،اوپر سے کھائی۔۔۔۔ پھر اندھیرا ایسا ہے کہ نظر بھی نہیں آرہا کہ کھائی کدھر ہے اور سڑک کدھر مڑ رہی ہے؟ ذرا آگے پیچھے ہوئے تو گاڑی کھائی کی نذر ہو گی۔''عمر نے جھر جھری لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ لوگ سر گوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔

''اللہ نہ کرے!'' حسین نے دہل کر کہا۔ کم خوفزدہ وہ بھی نہ تھا۔

''دیکھو! اندھیرے اور کھائی کی فکر نہ کرو۔ یہ جیپ والے یہیں کے رہائشی ہوتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے بھی ان راستوں پر گاڑی چلا سکتے ہیں۔ یہاں جتنے بھی حادثے ہوتے ہیں،وہ زیادہ تر کسی نہ کسی مسافر کوچ یا پھر عام گاڑیوں کو پیش آتے ہیں۔ یہاں پر جیپ چلانے والے کو شاذ و نادر ہی کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ البتہ مجھے فکر صرف اِس بات کی ہے کہ اِسے نیند نہ آجائے۔''مقدم نے کن انکھیوں سے نیند کے جھونکوں کو جھٹکتے راشد کو دیکھا،اُس کے الفاظ آدھے حوصلہ افزا اور آدھے حوصلہ شکن تھے۔ اِس سے قبل کہ کوئی جواب دیتا، راشد نے ایک مرتبہ پھر گاڑی روک دی۔

''اب کیا ہوا؟''موبائل میں کچھ دیکھتے نوید نے ماتھے پر بل ڈال کر اُسے گھورا۔

''دیکھو بھائی جان! ابھی تک ہم نے تمھارا سارا بات مانا۔ جو تم نے بولا وہ ہم نے کیا۔ کیا کہ نہیں؟''اُس نے تمہید باندھی۔

''جو کہنا ہے سیدھی طرح کہو!''نوید نے بیزاری سے کہا۔

''بھائی جان! ابھی ہم کو آرہا ہے نیند۔ٹھیک ہے!۔ابھی ہم کو کہیں چائے بھی نہیں ملے گا؟اوپر سے تمہارا یہ دوست شوست بھی آدم بیزار ہے۔یہ نہیں کہ کوئی ہلا گلا مچاؤ تاکہ ہمارا نیند بھاگے۔تم سارا لوگ،اتنا خاموش بیٹھا ہے کہ ہم کو نینداور زیادہ آرہا ہے۔''اُس نے مدعا بیان کیا۔

''تو کیا کریں؟تمہارے لیے محفل لگائیں اِدھر؟''حسین برامان گیا۔

''محفل نہ لگاؤ!ہم کو ہمارا گانا سننے دو۔ہم گانا سنتا رہے گا تو ہمارا دماغ جاگتا رہے گا۔پھر ہمارا گارنٹی ہے کہ ہم تم کو چلّم تک پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔'' بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔

''یہ سارا بہانہ تم اِس گانے کے لیے کر رہے ہو؟''نوید نے گھورا۔عجیب ہی مخلوق مل گئی تھی انہیں بھی۔

''ہم بہانہ نہیں کر رہا۔ہمارا توبہ جو ہم جھوٹ بولے تم سے!''اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''سننے دو یار گانے اُسے،میں اب بنا کہیں رکے چلّم پہنچنا چاہتا ہوں۔''مقدّم نے پیچھے سے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو نوید نے لب بھینچ کر راشد کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے!سن لو۔''اُس نے منہ بناتے ہوئے اجازت دی تو اُسکی باچھیں کھل گئی۔پہلے اُس نے بڑی فرصت سے پلیئر آن کیا،پھر اُس میں سے دو چار گانوں کو چلانے اور مسترد کرنے کے بعد اپنا مطلوبہ گانا لگایا اور بالآخر جیپ اسٹارٹ کر دی۔اب کہ نوید کڑے تیوروں کے ساتھ،ضبط کیے اُسے دیکھتا رہا،پر کہا کچھ نہیں۔اِس تمام صورتحال میں اُسکا اچانک نمودار ہونے والا بھتیجا،بس آنکھیں کھولے پٹر پٹر اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

میں سہرا باندھ کے آوں گا،میرا وعدہ ہے

میں تیری مانگ سجاؤں گا،میرا وعدہ ہے

راشد لہک لہک کر گانے لگا۔ حسین اور مقدّم نے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ عمر نے تو باقاعدہ سر ہی تھام لیا تھا۔ بھلا رات کے اس پہر کون ایسے گانے سنتا ہے؟ اللہ اللہ کر کے ایک گانا ختم ہوا، پھر دوسرا شروع ہو گیا۔ پہلے تو ڈیڑھ منٹ تک میوزک بجتا رہا، میوزک بتاتا تھا کہ یقیناً نوّے کی دہائی کا ایک اور بالی ووڈ گانا لگایا گیا ہے۔ پھر گانا شروع ہوا۔

مجھ سے محبت کا اظہار کرتی

کاش کوئی لڑکی مجھے پیار کرتی

سر پیٹنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا اِس پر؟ نوید نے ہتھیلی سے ماتھا مسلا، پھر جیسے ہمت ہارتے ہوئے چہرہ کھڑکی سے باہر کی جانب موڑ دیا۔ حالانکہ اُسکی جانب سے سوائے پتھریلے پہاڑ کے اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا، پر راشد کا منہ دیکھ کر خون جلانے سے بہتر پہاڑوں کو دیکھنا تھا۔

''مجھے کراچی کی تمام بسیں یاد آ رہی ہیں۔'' یہ تبصرہ رضا نے کیا تھا۔ باقی چاروں بیساختہ ہنسے تھے۔ پھر رضا نے کانوں میں ہیڈ فون ٹھونسا، اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اللہ جانے وہ کیا سن رہا تھا ہیڈ فون میں؟ پر وہ کچھ ہی دیر میں واقعی سو گیا تھا۔

علی نے رشک سے اُسکو دیکھا تھا جو بڑے مزے سے کان لپیٹے سو چکا تھا، البتہ وہ تو چلّم پہنچنے سے پہلے ہر گز سونے نہیں والا تھا۔

خوف بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

----------+---------+--------

چلم چوکی سے کچھ دور، کھائی کے قریب جب سورج نے اپنا چہرہ ٹھیک سے نہ دکھایا تھا، اور آسمان پر نیلاہٹ چھائی ہوئی تھی۔ عین اُسی لمحے جیپ بے قابو ہوئی اور اُسکا رخ سیدھا کھائی کی طرف ہو گیا۔ اِس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا، جیپ آپے سے باہر ہو کر سیدھی کھائی میں چلی گئی۔ جیپ میں چیخ و پکار مچ گئی، موت سامنے نظر آئی، حسین نے تو گھر میں اپنی میت پہنچنے تک کا منظر بھی دیکھ لیا۔ لیکن اللہ نے ابھی موت نہ لکھی تھی۔ فقط ایک پتھر۔۔۔۔ رب چاہے تو ایک پتھر بھی جان بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

وہ بھی ایک پتھر ہی تھا۔ کبھی کی ہوئی لینڈ سلائیڈ میں، سڑک کی کھائی والی طرف آکر ایسے ٹک گیا تھا، جیسے کوئی ستون ہو۔ پہاڑی پتھر تھا، لہٰذا تھا بھی بھاری بھر کم۔ صرف اُس ایک پتھر نے جیپ کو کھائی کے بالکل دہانے پر ایسے روک دیا کہ پتھر نہ ہوتا تو یقیناً وہ دس ہزار فٹ سے بھی زیادہ گہری، اُس کھائی کی بھینٹ چڑھ چکے ہوتے۔ جیپ کے ٹکرا کر رُکتے ہی وہ سب تیر کی تیزی سے باہر آئے تھے۔ نوید نے راشد کے بھتیجے کو بھی کھینچ کر باہر نکالا، اُس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔

''یا اللہ ! یہ کیا تھا؟'' عمر کا تو دماغ اب تک ماؤف ہو رہا تھا۔

''تم پاگل ہو کیا؟ مارے جاتے ابھی ہم سب؟'' نوید چیخا تھا۔ چلم چو کی آگے ذرا اونچائی پر نظر آ رہی تھی، کچھ لوگوں نے یہ حادثہ دیکھا تو تیزی سے نیچے اُتر کر انکی جانب آنے لگے۔

''ہم کو نہیں معلوم کیا ہوا تھا؟ جیپ ہمارا قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ نہ بریک لگ رہا تھا نہ گیئر کام کر رہا تھا۔'' اُس نے خوفزدہ انداز میں کہا تھا۔ وہ واقعی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

''میرے خیال سے گاڑی گرم ہو گئی ہے۔'' رضا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا، لیکن آواز اُسکی بھی ہانپ رہی تھی۔ باقی سب بھی اپنے ہاتھ پاؤں باقاعدہ کانپتے ہوئے محسوس کر سکتے تھے۔ وہ حادثہ ٹھیک ٹھاک خوفناک تھا۔

''آپ لوگ ٹھیک ہیں؟'' چو کی سے اتر کر آنے والے لوگوں میں سے ایک نے پوچھا تھا۔ کچھ وہاں کے رہائشی تھے، کچھ کیمپنگ کے لیے آنے والے لوگ تھے۔

''ہاں ! اللہ کا شکر ہے، کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوا۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''آپ لوگ سائیڈ پر ہو جائیں، ہم جیپ کو سڑک پر لیکر آتے ہیں۔'' ایک لڑکے نے کہا۔ پھر وہ لوگ کسی طرح دھکا لگا کر جیپ کو بیچ سڑک پر لے ہی آئے، پھر مزید دھکا لگاتے ہوئے اُسے ایک کنارے پر کھڑا بھی کر دیا، تاکہ پیچھے آنے والوں کو مشکل نہ ہو۔ اتنی دیر میں سورج بھی نکل آیا تھا۔ پہاڑوں پر پڑنے والی صبح کی کرنوں نے ہر منظر خوابناک بنا دیا تھا۔ قدرت کی ساری رعنائی یہیں سمٹ آئی تھی۔ رات کو خوفناک دکھنے والے دیو قامت پہاڑ، سورج کی پہلی کرنوں میں اپنے تمام تر حسن کے ساتھ جلوہ گر تھے، نیچے بہت دور دریائے استور بہتا ہوا آ رہا تھا۔

''گاڑی گرم ہو گئی ہے، اسے یہیں چھوڑ دیجئے اور چو کی تک پیدل آجائیں۔''ایک لڑکے نے اُنہیں کہا تو نوید نے سر ہلایا۔

''چلو! ہم اوپر چلتے ہیں، اپنا ضروری سامان ساتھ رکھ لو، حفاظت کے طور پر۔''نوید اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہتا آگے بڑھ گیا۔ چلّم یہاں سے کچھ اونچائی پر تھا، اُسکی فقط لکڑی کے کیبن نما چوکیاں ہی یہاں سے واضح تھیں۔ وہ لوگ اپنا اپنا سامان لیکر اوپر کی جانب بڑھے، پتھریلے راستے پر چلنا جیپ میں جانے سے زیادہ خوفناک تھا، ایک قدم بھی غلط پڑتا تو بندہ نیچے جاتا، اور ابھی ابھی وہ حادثہ دیکھ کر آئے تھے۔ سوائے مقدّم کے سبھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے، اور وہ پیدائشی پہاڑی آدمی! کھائی کے کنارے کنارے بڑے سکون سے چلتا، اُن سے پانچ منٹ پہلے ہی چلّم چوکی پہنچ گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ لوگ بھی ہانپتے ہانپتے چڑھائی چڑھ گئے۔ نوید بھی آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا پر وہ ہانپ نہیں رہا تھا۔

چوکی پار کی تو تاحد نگاہ نظر آنے والی خوبصورتی نے سانسیں روک دی۔ وہ حسن تھا کہ جنت؟ خدا بھی کیسا باریک بین ہے۔ کتنی تراش خراش سے دنیا بنائی ہے۔ صبح کی نیلی اور سنہری روشنی پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھو رہی تھی۔ کچی سڑک کے کنارے دو تین چھوٹے سے چائے کے ڈھابے تھے، جن کی چھتوں سے دھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ اندر مٹی کے چولہے پر اُبلتی چائے اور پراٹھے کی خوشبو سرد ہوا میں گھل مل رہی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب پہاڑوں کے درمیان کہیں نیچے، دریائے استور کا پانی بہتا سنائی دے رہا تھا۔ وہ نظر کم آرہا تھا، مگر اُس کی آواز مسلسل پس منظر میں موجود تھی۔ یہاں جو چیک پوسٹ تھی، اُس میں چند سپاہی گرم کوٹ پہنے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے لکڑی کی بیرکیں اور رکاوٹیں لگی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی جیپ یا لینڈ کروزر آکر رکتی تو مسافر گاڑی سے نکلتے، سرد ہوا کے جھونکے سے کانپتے ہوئے ہاتھ ملتے، اور پھر چائے کے کپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ یہ جگہ عجیب تھی۔ نہ مکمل آبادی، نہ مکمل ویرانی۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے یہ مقام پہاڑوں کے درمیان سفر کرنے والوں کی عارضی پناہ گاہ ہو۔

وہ لوگ بھی خوبصورتی کو روح میں محسوس کرتے ایک ڈھابے کے باہر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے کی تازہ خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ راشد بھی اپنے بھتیجے کو کسی کے حوالے کر کے اُنکے پاس آیا، غالباً اُسے یہیں کسی کے پاس چھوڑنے کی غرض سے ہی راستے سے لیا تھا۔

''ہم کو سونا ہے، ورنہ خدا کی قسم! ہم مر مرا جائے گا۔''اُس نے وہاں پہنچتے ہی شور ڈال دیا تھا۔

''لالہ! تم ادھر آ جاؤ!'' ایک دکان والے نے اُسے قریب رکھے تخت پر سونے کی پیشکش کی تھی۔

''تمہارا شکریہ بچے! اور تم لوگ سن لو۔ ہم کو کوئی چار گھنٹے سے پہلے نہ اٹھائے۔'' وہ پہلے بچے اور پھر اُن لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا تھا۔ نوید نے فقط اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ تیزی سے تخت پر جا کر ڈھیر ہوا اور فقط چند سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔

''آپ لوگ کیا لینا پسند کرے گا؟'' ایک پٹھان ڈھابے والے نے انکے قریب آتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے بس چائے!'' نوید نے موبائل پر کچھ لکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

''مجھے بھی صرف چائے!'' مقدّم نے بھی کہا۔ رضا اور حسین نے بھی چائے ہی طلب کی تھی۔ باقی دونوں نے چائے سے بھی انکار کر دیا تھا کہ طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔ ڈھابے کا مالک اُنکے منع کرنے کے باوجود چائے کے ساتھ گرم پراٹھے، اور کچھ خشک میوہ جات کی پلیٹ لے آیا۔

''لمبا سفر ہے، ہمارا طرف سے یہ سوغات سمجھو!'' مالک نے اپنائیت سے کہا تو دل نہ ہوتے ہوئے بھی اُن لوگوں کو کھانا پڑا تھا۔ البتہ نوید نے ایسی کوئی زحمت نہ کی تھی، اُس نے چند ہی گھونٹ میں چائے ختم کی اور کھڑا ہو گیا۔

''میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔'' وہ انہیں اطلاع دیکر چوکی سے واپس نیچے کی طرف اُتر گیا، اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''یہ کہاں گیا اب؟'' حسین سب سے پہلے مشکوک ہوا۔

''اُس نے بتایا نہیں ہے کہ کہاں گیا؟'' مقدم نے چڑ کر جواب دیا۔

''ہاں! اطلاع دے دی اُس نے، احسان ہے اُسکا۔'' حسین کو بھی برا لگا۔

''یہ تم دونوں ہاتھ دھو کر اُسکے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟'' رضا نے دونوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ ہم یہاں اُسکے آسرے پر ہیں اور وہ ہمیں چھوڑ کر نجانے کہاں چلا گیا ہے؟ اوپر سے بتایا بھی نہیں! کوئی مسئلہ ہو گیا تو؟'' حسین کی بات میں دم تھا۔

''ہم بچے ہیں؟ کوئی مسئلہ ہو بھی گیا تو ڈرائیور سامنے ہے، اور جیپ چوکی سے نیچے کھڑی ہے، ہم اُسے یہیں چھوڑ کر اسکر دو چلے جائیں گے۔'' یہ مفت مشورہ علی نے دیا تھا۔

''اور جائیں گے کہاں؟'' رضا کو اُسکا مشورہ پسند نہ آیا۔ ٹھنڈ سے اُسکی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

''کہیں بھی چلے جائیں گے، خالی جیب تو ہیں نہیں ہم!'' علی نے جواب دیا۔

''ہاں! اور یہ جو سارا منصوبہ ایف آئی اے نے بنایا ہے، اُسکا کیا؟'' رضا کو اختلاف کرنا ضروری تھا۔

''یہ اُسکا مسئلہ ہے، اُسکو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے۔'' حسین نے جواب دیا تھا۔

''آ جائے گا تھوڑی دیر میں، ویسے بھی راشد چار گھنٹے سے پہلے اُٹھنے نہیں والا، اور جیپ کو بھی ٹھنڈا کرنا ضروری ہے۔ تب ہی ہم آگے سفر کر سکتے ہیں۔'' رضا نجانے اُسکی طرف داری کیوں کر رہا تھا؟

''چار گھنٹے ہوں یا پانچ گھنٹے، اُسے یہیں رہنا چاہیے تھا۔ نہیں تو کم از کم بتا کر جانا چاہیے تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟'' مقدّم اور حسین ہمیشہ ایک پیج پر ہوتے تھے۔

''کیا وہ تمہارا دوست ہے؟'' اتنی دیر میں پہلی بار عمر نے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ اور اِس سوال پر لمحے کو سب خاموش ہوئے۔

''نہ تو وہ خود کو ہمارا دوست سمجھتا ہے، نہ ہم کسی فرینڈز ٹرپ پر آئے ہیں کہ اُسکے، اِس طرح بنا بتائے چلے جانے پر برا مانیں۔ وہ ہمیں یہاں لایا ہے، ہم اُسکی ذمّے داری ہیں تو وہ اپنی ذمّے داری پوری بھی کر لے گا۔ اُسکے کسی بھی عمل کو دل پر لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عمر نے بہت صاف گوئی سے کام لیا تھا، حتیٰ کہ وہاں بیٹھے کسی شخص کو اُس سے اِس حد تک صاف گوئی اور تلخ بات کی امید نہ تھی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اُسکی مرضی ہے، وہ جہاں جانا چاہے جائے۔'' رضا نے سب سے پہلے اُسکی تائید کی اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو گیا۔

تین گھنٹے مزید خاموشی سے سرک گئے۔ نوید واپس نہیں آیا، نہ اُنکے درمیان دوبارہ کوئی بات ہوئی۔ مقدّم اور حسین چلّم کے آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے، رضا نے بھی تھوڑی دیر بعد اُنہیں جوائن کر لیا۔ جبکہ عمر ایک مرتبہ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے

ہی سوچ چکا تھا۔ علی دوبارہ موبائل میں اپنی کل کی ڈاؤنلوڈ کی ہوئی ڈاکیومنٹری دیکھنے لگا تھا۔ اِس سفر سے اب وہ لوگ کچھ کچھ بیزار بھی ہو رہے تھے۔

مقدّم، حسین اور رضا اِدھر اُدھر مٹر گشتی کے بعد واپس کرسیوں کی جانب پہنچے تو دیکھا کہ ڈھابے کا مالک اپنی زبان میں کسی آدمی سے بحث کر رہا ہے۔ بحث، تلخ کلامی میں اور تلخ کلامی آہستہ آہستہ ہاتھا پائی میں تبدیل ہونے لگی تو آس پاس کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کروالیا۔ دوسرا آدمی اپنی زبان میں ڈھابے کے مالک کو دھمکی دیتا ہوا چلا گیا۔ مالک بھی تیزی سے اندر گیا اور دو چار لوگوں کو اکھٹا کر کے کوئی اہم مشاورت کرنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ دوسرا شخص واپس آیا، اِس بار اُسکے ساتھ دو چار اور لوگ تھے، سب کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں۔ دوسری جانب ڈھابے کا مالک بھی اپنے مشاورتی لوگوں کے ساتھ باہر آیا اور اِس بار اُنکے ہاتھوں میں بھی بڑی بڑی بندوقیں موجود تھیں۔ یہ سارا منظر نامہ دیکھ کر انکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ صورتحال کچھ یوں تھی کہ دونوں گروپ چلّم چوکی سے نیچے اترنے والے راستے پر تھے، جبکہ خود وہ لوگ نہ آگے جا سکتے تھے اور نہ پیچھے۔

دونوں گروپ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہے، پھر ڈھابے کے مالک نے گولی چلائی، اور پوری تسلی کی کہ گولی سامنے والے کو نہ لگے۔ غالباً یہ صرف دھمکانے کے لیے تھا، جواباً دوسرے فریق نے بھی فقط دھمکانے کے لیے ڈھابے کی لکڑی کی کھڑکی پر گولی چلادی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' فائرنگ کی آواز سن کر عمر گھبرا کر اٹھا تھا۔

''ہم کیا کریں اب؟'' علی نے بھی پریشانی سے مقدّم سے پوچھا۔

''انکا ذاتی معاملہ لگ رہا ہے، تم لوگ یہاں سے ہلنا مت ورنہ خوامخواہ کوئی نقصان نہ ہو جائے۔'' مقدّم نے کہا تو سب نے اُسے ایک ساتھ گھورا تھا۔

''یہاں بیٹھے رہے تو بھی کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جائیں گے۔'' رضا نے چبا چبا کر کہا۔

اِس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا، چوکی کے سپاہیوں نے آکر معاملہ رفع دفع کیا۔ دوسرا شخص جو لڑنے آیا تھا وہ گیا تو نہیں، البتہ غصّے میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے قریب ہی میز پر بیٹھ گیا۔

''یہ نوید آخر آ کیوں نہیں رہا؟'' علی کو حقیقتاً خوف محسوس ہوا تو بولا۔

''نوید کونسا اِنکا باپ ہے، جو انہیں دو تھپڑ لگا کر سیدھا کر دے گا؟'' رضا کو اُس سے اختلاف ضروری تھا۔

''یہ ہماری طرف کیوں آ رہا ہے؟'' حسین کی آواز پر سب نے پہلے اُسکا فق ہوتا چہرہ دیکھا، پھر اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہاں سے ڈھابے کا مالک آتا دکھائی دیا۔

''یہ ہمارے پاس نہیں، پیچھے بیٹھے شخص کے پاس آ رہا ہے۔'' عمر نے اندازہ لگایا، دوسرا شخص اُنکے پیچھے والی میز پر ہی بیٹھا تھا۔

''اگر ان دونوں نے یہاں پر گولیاں چلانی شروع کر دیں تو؟'' حسین نے پریشانی سے پوچھا۔ اتنی دیر میں ڈھابے کا مالک اُنکے پاس پہنچ کر رکا۔

''بچہ لوگ! تم لوگ ٹھیک تو ہے نا؟'' اُس نے اتنی نرمی سے پوچھا کہ اُنکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''آپ۔۔۔آپ ہم سے۔۔۔پوچھ رہے ہیں؟'' حسین نے تصدیق چاہی۔

''ہاں! ہاں! تم لوگوں سے ہی پوچھ رہا ہے۔ تم لوگوں کا چہرے پر ایسا بارہ کیوں بج رہا ہے؟ جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا تو اُنہیں اُسکی دماغی حالت پر شک گزرا۔

''وو۔۔۔وہ آپ۔۔۔ابھی فائرنگ کر رہے تھے نا! تو ہم بس پریشان ہو گئے تھے۔'' مقدم نے ذرا سنبھل کر کہا کہ آیا چاچا جی کو کوئی بات بری نہ لگ جائے۔

''ارے بچہ! اس میں پریشانی کی کیا بات؟ یہ تو ہم لوگوں کا چھوٹا موٹا بحث تھا۔ روز ہی ایسا ہو جاتا ہے۔ پریشان نہ ہو۔'' چاچا جی نے تو اُنکے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ یہ چھوٹی موٹی بحث تھی تو پھر پوری لڑائی میں یہ کیا کرتے ہوں گے؟

''اے زرولی!۔۔۔'' چاچا نے یکدم ہی پیچھے بیٹھے اپنے حریف کو مخاطب کیا تو، اُنکی تو باقاعدہ سانس ہی رک گئی۔

''اوس ہ ستو نزہ دہ؟ (اب کیا مصیبت ہو گئی ہے؟)'' اُس نے تڑخ کر پوچھا۔

''دا°ماریان زمو°.٥ملمانہ دي، داغریبانان ستاسو دکا°نوبہ املہ خپہ شوي دي. راشئ، راشئ اوبہ دی نہ معافی او غواڑے °نخہ.بخ°نہ وغوا°ئ!"۔(یہ شہری ہمارے مہمان ہیں، تمہاری حرکتوں کی وجہ سے غریب پریشان ہو گئے ہیں۔آؤ!آؤاوران سے معافی مانگو۔)''اُس نے اپنی زبان میں کوئی جواب دیا تواُس کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ تیزی سے اُٹھا۔اُسے اٹھتا دیکھ کر انکی رہی سہی ہمت بھی فنا ہو گئی۔

''اوہ پاگل کا بچہ! بندوق تو وہیں رکھ۔''ڈھابے کے مالک نے ڈانٹا تواُس نے جلدی سے بندوق میز پر چھوڑی اوراُنکے پاس آیا۔چہرے پر شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

''آپ لوگ ہمارا وجہ سے پریشان ہو گیا ہے۔ہم کو معاف کر دو! ہم تو ایسے ہی اِس سے لڑتا رہتا ہے۔''اُس نے اتنی اپنائیت سے کہا کہ انہیں اپنی سماعتوں پر شک گزرا۔کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر چل کیا رہا ہے؟

''معافی مانگو! مہمان ناراض ہو گیا ہے۔'' چچا نے مزید ڈانٹا تو اب کہ اُس نے کان ہی پکڑ لئے۔

''معاف کر دو نہ بھائی جان! خدا کا قسم! دوبارہ ایسا نہیں کرے گا۔''اُس نے کان ہی پکڑ لیے۔

''نہیں نہیں! کوئی بات نہیں۔ہم نے برا نہیں مانا۔''عمر نے جلدی سے معاملہ رفع دفع کیا۔

''تم لوگ آرام سے بیٹھو۔کچھ چاہیے ہو تو ہم کو کہنا۔'' چچا نے فراخ دلی سے کہا۔اُسی لمحے نوید بھی وہیں آیا۔

''آپ لوگ ابھی تو دشمنوں کی طرح لڑ رہے تھے۔اب کیا ہوا؟''مقدّم کو ہمت ملی تو پوچھ لیا۔

''دشمن؟ یہ ہمارا داماد ہے،ایسا چلتا رہتا ہے اِسکے ساتھ۔''وہ ہنستے ہوئے کہہ کر چلے گئے۔

''راشد کہاں ہے؟''اُنکے جانے کے بعد نوید نے سوال کیا۔جیسے اُسے یہاں ہوئے واقعہ سے کوئی سروکار نہ ہو۔اس سوال پر سب نے گردن موڑ کر اُس تخت کو دیکھا، جہاں راشد سویا ہوا تھا۔وہ اللہ کا بندہ اتنے شور شرابے کے باوجود ایک انچ بھی نہ ہلا تھا۔

''کیا نیند ہے بھئی؟''علی نے قابلِ رشک نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''کوئی اسے اٹھاؤ بھائی! میں آج کی تاریخ میں مزید کسی ایڈونچر کا متحمل نہیں ہو سکتا اب۔''یہ بے بس سی التجا حسین نے کی تھی۔

''میں اسے اٹھاتا ہوں۔ تم لوگ چلنے کی تیاری کرو۔''نوید نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا اور راشد کی طرف بڑھا۔امید تھی کہ وہ لوگ کوئی جواب دیں گے مگر کسی نے کوئی ردعمل نہ دیا۔نوید نے تخت کے پاس آکر سوئے ہوئے راشد کو ہلایا۔تو اُس نے نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھا، پھر نہایت ہی برا منہ بنا کر بولا۔

''اب کیا قیامت آگیا ہے؟''

''چار گھنٹے پورے ہو گئے ہیں، چلو اُٹھو شاباش!''نوید نے کہا نہیں تھا، بلکہ کندھوں سے پکڑ کر اُسے بٹھا دیا تھا۔

''ماڑا! تم کو بھی چین نہیں ہے ویسے۔۔۔''اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''جیپ لیکر آؤ اوپر، ہم دیوسائی جائیں گے۔''

''تم ہم کو ایک مرتبہ کیوں نہیں بتا دیتا کہ کہاں جانا ہے؟ ہر تھوڑا دیر بعد ہم کو ایک نیا منزل بتاتا ہے۔ایسا کرتے کرتے تم پورا پاکستان نہ گھما دینا ہم کو۔۔۔''اُس نے بے پر کی ہانکی تھی۔نوید نے اُسے سنجیدہ نظروں سے گھورا تو وہ شرافت سے کھڑا ہو گیا۔

''جا رہا ہے! جا رہا ہے۔ہر وقت ہم کو ایسے گھورتا مت رہا کرو۔ہمارا بیوی یاد آجاتا ہے ہم کو، وہ بھی ایسا ہی۔۔۔''وہ با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے چوکی سے نیچے کی جانب بڑھ گیا۔نوید دوبارہ اُن لوگوں کے پاس آیا جو جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

''وہ جیپ لیکر آرہا ہے۔''اُس نے اطلاع دی۔ اس بار بھی کسی نے کوئی خاص ردعمل نہ دیا تو اُس نے بھنویں سکیڑ کر کچھ اچھنبے سے اُنہیں دیکھا۔ کیا انہیں اُسکا بنا بتائے جانا برا لگا تھا؟ اُس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اندازہ لگا لیا تھا۔اب کہ وہ بھی خاموشی سے وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔کچھ ہی دیر میں راشد جیپ لیے واپس چوکی سے اوپر کی جانب آگیا۔

''آجاؤ بیٹھو!''اُس نے جیپ کے اندر سے جھانکتے ہوئے کہا تو وہ لوگ باری باری اندر بیٹھنے لگے۔

''سچ بتاؤں تو مجھے اب اِس جیپ سے ڈر ہی لگ رہا ہے۔''حسین نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

''لگ تو مجھے بھی رہا ہے، لیکن اب کیا ہی کر سکتے ہیں؟''علی نے بھی اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا نام لو، سفر کی دعا پڑھو۔اور بس! صحیح سلامت پہنچنے کی امید رکھو۔مجھے اب خود بھی اِس آدمی اور اسکی جیپ پر بھروسہ نہیں ہے۔'' مقدّم نے کہا۔

''نوید کو چاہیے تھا کہ وہ یہاں سے ڈرائیور اور جیپ تبدیل کرلیتا۔'' عمر نے کہا۔

''نوید کی مرضی بھئی! ہم کون ہوتے ہیں مشورہ دینے والے؟'' حسین زیادہ ہی تپا ہوا تھا۔

''تم دے سکتے ہو، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔اور اگر پہلے یہ مشورہ دے دیتے تو میں چار گھنٹے سونے میں برباد کرنے کے بجائے کوئی نئ جیپ تلاش کرلیتا۔'' اُسی لمحے جیپ کا سامنے والا دروازہ کھلا اور نوید نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ سب کو لمحوں کے لیے سانپ سونگھا۔

''تم سو رہے تھے؟'' علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے سر ہلایا۔راشد جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔

''کہاں؟'' یہ سوال سب کے لبوں پر تھا۔

''جیپ میں!'' مختصر جواب دیا۔

''اوہ ماڑا!۔۔۔جبھی ہم کہہ رہا ہے کہ جیپ میں کس کا پرفیوم کا خوشبو آرہا ہے، اتنا دیر سے؟'' یہ تبصرہ راشد نے کیا تھا، نوید نے فقط گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

''تو تم یہ بات بتا کر بھی جا سکتے تھے۔'' حسین نے بالآخر کہہ دیا۔حالانکہ کچھ گھنٹوں قبل ہی عمر نے اسے ٹھیک ٹھاک سبق پڑھایا تھا۔پر نہیں! وہ بھی حسین تھا۔

''مجھے لگا کہ تم اتنے عقلمند تو ہوگے کہ خود ہی سمجھ جاؤ۔'' اُس نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔یہ جواب تھا یا بے عزتی؟ حسین نے دانت کچکچائے۔

''لالہ! تم ہم کو ایک بات بتاؤ!'' یکدم ہی راشد نے نوید کو مخاطب کیا۔

''کیا؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم کیا کوئی غنڈا ونڈا ہے ؟''اِس سوال نے نوید کے علاوہ سب کے لبوں پر بیساختہ تبسم بکھیرا تھا۔

''ہوا بھی تو تم کیا کرلوگے ؟'' یہ سوال مقدّم نے پوچھا تھا۔

''ہم کیا کرے گا بھلا؟ہم تو شریف آدمی ہے۔اور شریف تو تم لوگ بھی لگتا ہے۔بس یہ غنڈا آدمی پتہ نہیں تمہارا ساتھ کیا کر رہا ہے ؟ کہیں اغواو غوا تو کر کے نہیں لے جارہا تم لوگوں کو؟''اُس نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا۔

''کیا تم خاموشی سے گاڑی چلاؤ گے ؟''نوید کے سوال نے اُسے چپ کروایا۔کچھ دیر وہ خاموش رہا، پھر زبان میں دوبارہ کھجلی ہوئی تو بولا۔

''بات سنو!''چونکہ نوید اُسکے برابر میں تھا لہٰذا ہمیشہ اُسکا مخاطب وہی ہوتا تھا۔ اُس نے کوفت سے راشد کو دیکھا۔

''کیا ہم گانا چلا سکتا ہے ؟''

''نہیں!''اُس نے قطعی لہجے میں کہا۔

''پر ہم کو مزا نہیں آتا بنا گانے کے۔''اُس نے منہ بنایا۔

''سفر میں گانے سننے کے بجائے اللہ کو یاد کرو، ابھی پیچھے مرنے والے تھے نا ہم؟ گانا سنتے مر گئے تو کیا منہ دکھاؤ گے اللہ کو؟'' یہ جواب رضا نے دیا تھا۔رضا سے اِس جواب کی کسی کو توقع نہ تھی، غالباًوہ بھی تنگ آگیا تھا اُسکے گانوں سے۔

''تم خود کیا سن رہے تھے ہیڈ فون میں ؟''علی نے سیدھا طنز کیا۔

''سورۃ رحمٰن!''اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ خجل ہوا۔

''وہ چپ ہوتا ہے تو یہ دونوں شروع ہو جاتے ہیں۔ کیا خاموشی سے سفر نہیں کر سکتے ؟''مقدّم نے منہ بناتے کہا تھا۔پھر وہاں حقیقتاً خاموشی چھا گئی۔

----------+---------+--------

دیوسائی، دیو کی سرزمین۔ جب جیپ دیوسائی میدان کی سرحد میں داخل ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئے ہوں۔

سامنے ایک بے حد وسیع میدان پھیلا ہوا تھا، اتنا وسیع کہ آنکھ اس کا کنارہ تلاش کرتے کرتے تھک جائے۔ ہوا یہاں صاف اور ٹھنڈی تھی۔ جیپ کے شیشوں سے باہر نظر آتے گھاس کے لمبے نرم پتے ہوا کے ساتھ لہروں کی طرح جھوم رہے تھے۔ کبھی بادل نیچے آ جاتے اور چند لمحوں کے لیے پورا میدان دھند کی سفید چادر میں چھپ جاتا، پھر اچانک سورج کی کرنیں بادلوں کے بیچ سے نکل کر زمین پر سنہری روشنی بکھیر دیتیں۔ دور کہیں پانی کی باریک دھاریں گھاس کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی بہہ رہی تھیں۔ ان کے کنارے چھوٹے چھوٹے جنگلی پھول کھلے تھے۔

وہاں کھڑے ہو کر اُنہیں پہلی بار محسوس ہوا کہ زمین کتنی وسیع ہے اور انسان اُس کے مقابلے میں کتنا چھوٹا؟ یہاں ہر شے پہلے سے زیادہ حسین تھی، اور جس شے نے دلوں کو کچھ دیر کے لیے ساکت کر دیا وہ تھی شیوسر جھیل۔

شیوسر جھیل دیوسائی کی سب سے مشہور اور خوبصورت جھیل ہے۔ یہ جھیل دیوسائی نیشنل پارک کے عین وسط میں واقع ہے اور سطحِ سمندر سے تقریباً 4142 میٹر (13,589 فٹ) کی بلندی پر ہے۔

جھیل کا پانی حیرت انگیز طور پر صاف اور نیلا تھا۔ ہوا بالکل ہلکی سی بھی چلتی تو اس کے پانی میں آسمان کے بادل لرزتے ہوئے دکھائی دینے لگتے۔ کبھی کبھی پانی اتنا پر سکون ہوتا کہ دور کھڑے پہاڑ اس میں مکمل عکس کی طرح نظر آتے۔ جھیل کے گرد گھاس کے وسیع میدان پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے، جو ہلکے پیلے، سفید اور بنفشی رنگوں سے زمین کو سجا رہے تھے۔ موسم صاف تھا، یہاں سے دنیا کے عظیم پہاڑوں میں سے ایک، نانگا پربت کی برفانی چوٹی بھی دور آسمان کے کنارے دکھائی دے رہی تھی۔

''دیوسائی میدان دراصل صرف ایک میدان نہیں بلکہ ایک محفوظ قدرتی علاقہ ہے جسے دیوسائی نیشنل پارک کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستان کے بلند ترین نیشنل پارکوں میں سے ایک ہے اور تقریباً 4100 میٹر (13,500 فٹ) کی بلندی پر واقع ہے۔ اسے 1993 میں نیشنل پارک قرار دیا گیا تاکہ یہاں کے نایاب جانوروں اور ماحول کو محفوظ رکھا جا سکے۔'' وہ لوگ جھیل کے کنارے بیٹھے تھے۔ راشد نے دیوسائی پہنچ کر پھر سے سونے کا شور مچا دیا۔ اِس بار نوید نے بنا کسی اعتراض کے اُسے دو گھنٹے آرام کی اجازت دے دی تھی۔ وہ وہیں گھاس پر اپنی شال کو گول مول کر کے سر کے نیچے رکھے سو گیا۔ اِس بار کسی کو بھی قیام کرنے پر اعتراض نہ تھا۔ سفر انسان کی صحت پر اچھا اثر ڈالتا ہے،

رضا جیسے آدم بیزار انسان کو بھی دیوسائی کی خوبصورتی نے مسمرائز کر دیا تھا۔ یہ جگہ اتنی خوبصورت تھی، کہ دل کرتا تھا یہاں رک کر اُسے دل میں سمو لیا جائے۔ اگر وہ یہاں رکے بنا چلے جاتے تو یقیناً تا عمر پچھتاتے۔ اِس لیے وہ بھی جھیل کے کنارے بیٹھ گئے۔ مقدّم اُنہیں، اُنکی مرضی کے بنا ہی دیوسائی کے متعلق تمام معلومات فراہم کرنے لگا۔ نوید البتہ خاموشی سے ادھر اُدھر ٹہلتا، اپنے موبائل میں مسلسل کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ یقیناً وہ فرّخ صاحب سے رابطے میں تھا، اور انہیں ہی پل پل کی خبر دے رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ نظریں اٹھا کر اُنہیں بھی دیکھ لیتا۔

''دیوسائی کا سب سے مشہور جانور ہمالیائی بھورا ریچھ ہے۔ کسی زمانے میں یہ ریچھ تقریباً ناپید ہونے کے قریب تھا، لیکن نیشنل پارک بننے کے بعد اِس کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ عموماً گرمیوں میں دیوسائی کے میدانوں میں خوراک تلاش کرتا ہے اور سردیوں میں غاروں میں چلا جاتا ہے۔ یہ یہاں سب سے زیادہ نظر آنے والا جانور ہے۔ پھر ہمالیائی مارموٹ، یہ گلہری کی بڑی قسم ہے۔ یہ زمین میں بل بنا کر رہتا ہے اور اکثر گھاس کے میدانوں میں سیدھا کھڑا ہو کر سیٹی جیسی آواز نکالتا ہے۔ اِسکے علاوہ یہاں نایاب شکاری جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے برفانی چیتا، یہ بہت کم نظر آتا ہے، کیونکہ یہ زیادہ تر اونچے پتھریلے پہاڑوں میں رہتا ہے، اِسکے علاوہ یہاں سنہری عقاب، سرخ لومڑی، ہمالیائی آئبیکس، مختلف جنگلی پرندے اور بطخیں بھی ہیں۔ گرمیوں میں یہاں سینکڑوں اقسام کے جنگلی پھول بھی کھلتے ہیں، جس سے پورا میدان رنگین ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ تم ابھی دیکھ سکتے ہو۔''

''تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہاں پر ریچھ اور چیتے بھی ہوتے ہیں؟'' حسین کو صرف یہی سمجھ آیا تھا۔

''ہاں!''

''اور وہ بھی کھلے ہوئے؟ مطلب کبھی بھی یہاں آ سکتے ہیں؟''

''بالکل! اسی لیے اسے نیشنل پارک کہتے ہیں۔'' اُس نے زور و شور سے سر ہلاتے کہا۔

''اور اگر یہاں کوئی ریچھ آ گیا؟ یا کوئی چیتا؟''

''چیتا عموماً یہاں نہیں آتا، وہ پہاڑوں پر رہتا، ہاں! ریچھ وغیرہ رات کو آ سکتے ہیں۔ اس لیے کیمپنگ والوں کو کافی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''

''بہت شکریہ! میری معلومات میں اضافے کے لیے، اب ذرا اپنی زبان کو آرام دو، تھک گئے ہوگے اتنا بول کے۔'' حسین نے فراخ دلی سے کہا تو اُس نے فقط گھورنے پر اکتفا کیا۔

''میں نے اتنی خوبصورت جگہ پہلی بار دیکھی ہے۔'' رضا نے بیساختہ تعریف کی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار شمالی علاقہ جات کا سفر کر رہا تھا۔ پہلے اُسکے پاس اتنے وسائل نہیں تھے اور جب وسائل آئے، تو وقت ہی نہ ملا کبھی شہر سے باہر جا کر گھومنے پھرنے کا۔

''میں نے بھی۔'' حسین کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور رضا کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر نجانے اُس سے کونسے راز و نیاز کرنے لگا؟ علی بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' مقدّم نے اپنے برابر پاؤں پسارے بیٹھے عمر سے آہستگی پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں اب، سفر کی وجہ سے تھکن تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے میں سوچ رہا تھا، اگر میں کبھی ایسے ہی آتا، گھومنے پھرنے کی نیت سے، تو یقیناً اس جگہ کیمپنگ کرتا۔'' عمر نے سامنے نظر آتے تا حد نگاہ پھیلی، رنگ برنگی سرزمین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پر اس وقت ہم اپنی جان بچانے کے لیے یہاں آئے ہیں۔'' مقدّم کہہ کر خود ہی ہنسا۔

''یہ ریئلٹی چیک مجھے اس وقت ہر گز پسند نہیں آیا۔'' عمر نے کہا۔ '' پر میں خوش ہوں کہ زندگی میں کم از کم تمہارے ساتھ تو ہوں۔'' پھر مسکراتے ہوئے بولا تو مقدّم بھی مسکرا دیا۔

''اِس بات کی مجھے بھی خوشی ہے کہ تم مجھے مل ہی گئے اس زندگی میں۔ ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ اب شاید کبھی ملاقات نہ ہو۔'' مقدّم نے کہا۔

''اور مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں کا رومانس پھر سے شروع ہو چکا ہے۔'' پیچھے سے حسین اچانک ہی نمودار ہوتا دونوں کے درمیان آ بیٹھا تھا۔ اس بات پر کافی دیر سے محو سوچ علی بیساختہ ہی ہنسا۔ حالانکہ اُس نے یقیناً عمر و مقدّم کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی تھی۔ مگر حسین کا تبصرہ اُسے ہنسنے پر مجبور کر گیا تھا۔

''حسین!''عمر نے سنجیدگی سے اُسے پکارا۔

''جی فرمایئے۔''وہ سعادت مندی سے بولا۔

''شٹ اپ!''اُس نے اتنی ہی سنجیدگی سے کہا تو اب کہ مقدّم اور حسین دونوں ہنس دیئے۔

''دوسرے لفظوں میں یہاں سے دفع ہو، کباب میں ہڈی نہ بنو۔''حسین نے خود ہی ترجمہ کیا تو عمر ناچاہتے ہوئے بھی مسکرایا۔

''ویسے لفظ غلط استعمال کیا ہے تم نے، بر ومانس کہتے ہیں اسے۔''مقدّم نے لگے ہاتھوں تصحیح کی۔

''یہ محبت ہم سے تو نہ جتائی تم نے کبھی؟''زماں و مکاں کا اثر تھا، قدرت کے حسن نے انکے اندر بھی ایک عجیب سی طمانیت بھر دی تھی۔وہ بھی پریشانیاں بھلائے عجیب و غریب گفتگو میں وقت برباد کرنے لگے۔

''محبت دو طرفہ عمل ہوتی ہے۔اب میں اس میں کیا کر سکتا ہوں؟''اُس نے کندھے اچکاتے کہا۔

''ایک طرفہ بھی ہو سکتی ہے اگر کوئی کرنا چاہے تو۔۔۔''حسین نے جتایا۔

''کیا تم لوگوں کے پاس بات کرنے کے لیے موضوعات ختم ہو چکے ہیں؟''رضا نے وہاں آتے ہوئے کہا۔

''تم دے دو کوئی اہم موضوع۔۔۔''اُس نے کھلی پیشکش کی۔

''تم نے پھر گھوم پھر کر اپنے مطلب کے ہی موضوع پر آجانا ہے۔''وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''تو پھر مشورے نہ دو۔''حسین نے ڈھٹائی سے کہا تو اُس نے گھورا۔

''بھاڑ میں جاؤ!''پھر منہ جھیل کی طرف کر کے بیٹھ گیا۔

''تم کیوں اتنا خاموش ہو؟''یکدم ہی عمر نے علی کی خاموشی کو نوٹ کیا تو پوچھا۔

''سر میں بہت درد ہے۔''اُس نے گردن دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں جھٹکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! سفر کی وجہ سے۔''عمر نے اندازہ لگایا۔

''معلوم نہیں! اور یہ سفر بھی تو ختم ہی نہیں ہو کر دے رہا۔ میں اب سکون سے ایک جگہ سونا چاہتا ہوں۔'' علی نے بیزاری سے کہا۔ یہ سفر تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا تھا۔

''فکر نہ کرو! یہ آخری اسٹاپ ہے۔ اگلی منزل اسکردو ہے۔'' اس آواز پر سب نے چونک کر دیکھا تو نوید اُنکے سروں پر کھڑا تھا۔ سب نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اُس نے پہلی بار گفتگو میں خود حصّہ لیا تھا۔

''تو چلو پھر اگلی منزل، میں اب یہاں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔'' علی نے کہا۔ حالانکہ باقی چاروں تو پورا دن بھی یہاں بیٹھنے کو تیار تھے، پر علی کے سر کا درد اُسے کسی طور بھی چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

''ڈیڑھ گھنٹے ہو گئے ہیں، آدھا گھنٹہ اور رک جاؤ پھر میں راشد کو اٹھاتا ہوں۔'' اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے کہا، پھر دوبارہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔ اب کہ وہاں مکمل خاموشی چھا گئی۔

گردن کو ہاتھ سے دباتے علی کی نظریں رضا پر گئیں۔ وہ خاموشی سے سامنے نظر آتے پہاڑ کو دیکھتا نجانے کیا سوچ رہا تھا؟ علی اُسے بغور دیکھنے لگا۔ وقت کچھ پیچھے ہونے لگا، گھڑی کی سوئیاں الٹی چلنے لگی، دیوسائی رضا کے اسکول کی دیواروں میں تبدیل ہو گیا۔ اب رضا اپنے اسکول کی انتظار گاہ میں ایک بینچ پر بیٹھا تھا، ساتھ میں احمد بھی تھا۔

علی اُس وقت نشمیہ کو لینے وہاں آیا، تو احمد کو رضا کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رکا۔ پھر ستون کی آڑ لیکر کھڑا ہو گیا۔ احمد پرائمری میں تھا لہٰذا اُسکا ابھی لنچ بریک تھا، البتہ نشمیہ کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا علی اُسے ہی لینے آیا تھا۔

''تمہیں فٹبال بہت پسند ہے؟'' رضا نے احمد سے پوچھا۔

''ہونہہ۔۔۔'' اُس نے بس سر ہلا دیا تو رضا مسکرایا۔ وہ خاموش طبع تھا، پر چہرے پر معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

''تم کسی سے دوستی کیوں نہیں کرتے؟'' اُس نے پھر پوچھا۔

''دل نہیں کرتا۔'' اُس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ستون کے پیچھے کھڑے، اُنکی تمام گفتگو بخوبی سنتے علی کو اِس سوال و جواب کا مقصد سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''کیوں دل نہیں کرتا؟'' رضا نے کرید نا چاہا۔

''بس! نہیں کرتا۔'' اُس نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''گھر پر کھیلتے ہو فٹبال؟'' رضا نے پوچھا تو اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''کوئی کھیلتا ہی نہیں ہے۔'' اس بات پر علی کا دل کٹا۔

''کیوں؟ تم اپنی بہن کے ساتھ کھیل لیا کرو نا!''

''وہ لڑکی ہے، وہ میرے ساتھ فٹبال نہیں کھیلتی، اسکو ڈول ہاؤس پسند ہے۔'' رضا کو بچوں سے بات کرنے کا ہنر آتا تھا، ورنہ اتنی بات تو احمد نے کبھی کسی سے نہیں کی، وہ جلد گھلنے ملنے والا بچہ تھا ہی نہیں۔

''تو اپنے بابا کے ساتھ کھیل لو، وہ تو لڑکی نہیں ہیں۔'' اس بات پر وہ بیساختہ ہنسا۔ معصوم سی۔۔۔ پیاری سی ہنسی۔ آخر وہ تھا تو بچہ ہی۔ علی نے ٹھہر کر اپنے بیٹے کو دیکھا، جسکی ہنسی سنے اسے زمانے ہو گئے تھے۔

''تو بابا کے ساتھ کھیلا کرو نا! پریکٹس ہو گی تمہاری۔'' اُس نے اپنی بات دہرائی تو وہ ایک مرتبہ پھر سنجیدہ ہوا۔

''وہ میرے ساتھ کھیلنا، مجھ سے بات کرنا، اور میرے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔'' اُس نے شکوہ کیا، شاید پہلی بار کسی سے شکوہ کیا۔

''اور یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتے؟'' اس سوال کا اُسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''کیا اُنہوں نے تم سے کہا کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتے؟'' رضا نے اُسے بولنے پر اُکسایا۔

''نہیں! پر وہ مجھے بہت ڈانٹتے ہیں۔ ہر وقت غصّہ کرتے ہیں۔'' اُس نے دکھ سے کہا تو رضا نے بغور اسے دیکھا۔ علی جیسی آنکھیں، ویسا ہی چہرہ، وہی روٹھا روٹھا انداز۔ وہ اپنے باپ کا منی ورژن تھا۔ وہ مسکرایا۔ دوست سے اپنائیت الگ ہوتی ہے، پر دوست کی اولاد سے انسیت اپنی جگہ ہوتی ہے۔

''تم بھی تو غصّہ کرتے ہو۔''اِس بات پر اُس نے آنکھیں پھاڑ کر رضا کو دیکھا۔

''میں؟ میں کب کرتا ہوں؟''

''کرتے ہو۔''رضا اپنی بات پر قائم تھا۔''جب کوئی تم سے زبردستی بات کرنا چاہتا ہے، تو تم ڈانٹ دیتے ہو۔ جب کوئی تمہیں کھیلنے بلاتا ہے، تو تم جھنجھلا کر وہاں سے چلے جاتے ہو۔ جب کوئی تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے، تو تم اسے جھڑک کر اپنے آپ سے دور ہٹا دیتے ہو۔ جب تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی تو دوسروں کو برے لگتے ہو گے۔''وہ حیران ہوا، رضا نے کتنے جلدی اُس پر غور کر لیا تھا۔

''پر۔۔۔پر وہ تو۔۔۔۔''اُس سے کوئی بہانہ نہیں بنا۔

''ہاں! میں سن رہا ہوں۔''اُس نے نرمی سے کہا۔

''وہ میری پرسنل اسپیس(ذاتیات) ہے۔ میں ان کمفرٹیبل(غیر آرام دہ) فیل(محسوس) کرتا ہوں۔''

''تمہارے بابا کی بھی تو کوئی پرسنل اسپیس ہو سکتی ہے، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بہت ڈیسیپلینڈ(نظم و ضبط کے پابند) ہوں۔ اُنہیں تمہاری بہت سی باتیں پسند نہ آتی ہوں۔ وہ بھی تو ان کمفرٹیبل ہو سکتے ہیں نا!''احمد چپ کا چپ رہ گیا۔ علی سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا، سمجھانے کا کتنا پیارا انداز تھا۔ رضا نے کہاں سے سیکھا؟

''کیا تم نے کبھی اپنے بابا سے جا کر پیار سے بات کرنے کی کوشش کی؟ کیا تم نے کبھی انہیں گلے لگایا؟ کیا تم نے کبھی اُن کو بتایا کہ تم اُن سے کتنا پیار کرتے ہو؟''

''نہیں!''اُس نے دھیرے سے کہا۔

''کیوں؟''

''مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے، وہ مجھے ڈانٹ دیں گے۔''رضا مسکرایا، یعنی وہ اپنے باپ کو یہ سب کہنا چاہتا تھا، پر ڈرتا تھا۔ علی مسکرا بھی نہ سکا۔

''کیوں ڈانٹ دیں گے؟ کیا وہ جلاد ہیں جو ہر وقت ڈانٹتے ہی رہیں گے؟''اِس سوال پر وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہوا۔

''کیا وہ تمہاری بہن کو بھی ڈانٹتے ہیں؟ وہ تو بہت ڈھیٹ ہے، روز صبح تمہارے بابا کو پیار کر کے، گلے لگا کر خدا حافظ کہتی ہے۔''

''آپ سب دیکھتے ہیں؟''اس سوال پر رضا کا قہقہہ بیساختہ تھا۔

''وہ تم سے بھی بہت پیار کرتے ہیں احمد! تمہارے ساتھ کھیلنا بھی چاہتے ہیں، تم سے بات بھی کرنا چاہتے ہیں۔پر تم بھی تو کوشش کرونا! اگر تم خود اپنے بابا سے جا کر کہو گے کہ تم اُن سے پیار کرتے ہو، اُنکو گلے لگاؤ گے تو وہ کیوں تمہیں ڈانٹے گے؟ وہ نشمیہ کو تو نہیں ڈانٹتے۔'' علی کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکا۔

''ڈانٹ اُسے بھی پڑتی ہے، پر وہ برا نہیں مانتی۔''اس بار احمد نے خود ہی کہا۔

''ہاں! پر کیا وہ اُسے پیار کرنے پر بھی ڈانٹتے ہیں؟ وہ تم سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی تمہاری بہن سے۔''

''آپ کو کیسے پتہ؟''

''کیونکہ۔۔۔''وہ رکا، علی کا پورا وجود سماعت بن گیا۔''کیونکہ تمہارے بابا میرے دوست ہیں۔بہت پرانے۔۔۔جب ہم خود اسٹوڈنٹ تھے، پڑھتے تھے، ٹیچر سے ڈانٹ سنتے تھے۔تب سے۔۔۔''اِس بات پر علی کی آنکھوں میں سن سارہ گیا، جبکہ اُسکے بیٹے کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

''کیا وہ آپکے دوست تھے؟ کیا وہ آپ پر بھی غصّہ کرتے تھے؟''اسے یقین نہ آیا۔

''کرتے تھے، مگر تھوڑا تھوڑا۔بلکہ وہ ہنستے زیادہ تھے، ہم کھیلتے بھی تھے، تمہارے بابا کو کرکٹ پسند تھی۔وہ اچھے باؤلر تھے۔''وہ یاد کر کے بتا رہا تھا۔اسے علی کے متعلق ہر شے یاد تھی، جبکہ علی ساکت سا اسے سن رہا تھا۔

''وہ اچھے آرٹسٹ تھے، وہ بہت اچھی پینٹنگ کرتے تھے۔ایک بار انہوں نے مجھے ایک کیلیگرافی تحفے میں دی تھی۔وہ میرے پاس آج بھی رکھی ہوئی ہے۔وہ کبھی غصّہ نہیں کرتے تھے۔بلکہ وہ تو ہمارے ساتھ بہت ہنستے تھے۔''رضا کو نجانے کیوں؟ پر وہ یونیورسٹی کے زمانے کا ہنستا مسکراتا علی یاد آگیا تھا۔جبکہ اس سے دور کھڑے علی کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

''تو وہ اب ایسا کیوں کرتے ہیں؟''وہ شاید اپنے باپ سے بہت زیادہ مایوس تھا۔

''دیکھو بیٹا! بڑے لوگوں کی زندگی میں بہت سی پریشانیاں ہوتی ہیں۔اِس لیے وہ تھوڑا ایسے ہو جاتے ہیں۔ہاں! اُنہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، پر ایسا ہو جاتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم بھی اپنے بابا کے دوست بن جاؤ،اُن سے انکی پریشانی پوچھو۔اُن کو گلے لگاؤ،اُن کو بتاؤ تم اُن سے کتنا پیار کرتے ہو۔وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔تم ایسا کرو گے نا؟''

''میں کوشش کروں گا۔''اُس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو رضا مطمئن ہوا۔

''اور سنو!''اس نے یکدم ہی کہا۔

''کیا؟''

''ہر گز اپنے باپ کو مت بتانا کہ یہ میں نے تم سے کرنے کو کہا ہے۔''اس بات پر علی کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ بکھری۔

''کیوں؟ وہ آپکو بھی ڈانٹیں گے؟''اُس نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔شاید پہلی بار۔۔۔ رضا حیران ہوا۔

''اُسکی مجال کہ مجھے ڈانٹے؟''

''تو آپ اُن سے ڈر کیوں رہے ہیں؟''رضا تو رضا پیچھے کھڑا علی بھی حیران رہ گیا۔اب احمد کی آنکھیں بھی شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''میں کیوں ڈرنے لگا؟''

''آپ ڈرتے ہیں نا!''شرارت اُسکے آنکھوں سے اُسکی مسکراہٹ تک پہنچ گئی۔

''اوہو۔۔۔ تو تم پر بھی اپنی بہن کا اثر ہو گیا ہاں!''رضا نے اسکو گدگدایا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا۔اُسکی ہنسی نے علی کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔اگر اُسکے اور رضا کے درمیان فاصلوں کی اتنی دیواریں نہ ہوتی تو شاید وہ اُسکو گلے لگا لیتا۔اُس نے اُسکے بیٹے کو ہنسایا تھا،اُسکے اندر کا کھویا ہوا بچہ باہر نکال دیا تھا۔

''لنچ ٹائم ختم ہو گیا ہے، چلو بھاگو یہاں سے اپنی کلاس میں۔۔۔ جلدی!''رضا نے اُسے اُسکی پیٹ تھپتھپاتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے اپنی کلاس کی طرف بھاگ گیا۔۔وہ بچہ ہی تھا۔۔۔ایک چھوٹا سا معصوم بچہ۔۔۔اسے فقط توجہ و محبت کی ضرورت تھی۔

علی کچھ بھی کہے بناواپس پلٹ آیا، باہر آکر گارڈ سے نشمیہ کو بلوانے کی درخواست کی اور گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ نم آنکھوں کو رگڑ کر خشک کیا، پھر گہری سانس لیکر خود کو نارمل کرنے کی ناکام کوشش کی۔

آخر کیوں تھے اُسکے دوست ایسے ؟ کوئی تعلق نہ رکھ کر بھی تمام تعلقات نبھا جاتے تھے ؟ اُسکی ہزار غلطیوں، ہزار کوتاہیوں کے باوجود اُسکا بھرم رکھ لیتے تھے۔ نشمیہ اُس سے نہیں سنبھلتی تھی، پر عمر اُسے سنبھال لیا کرتا تھا۔ احمد کو جو بات وہ نہ سمجھا سکا، وہ رضا نے سمجھا دی۔

''ہم نکل رہے ہیں۔'' نوید کی آواز پر وہ حال میں واپس آیا۔ رضا اب اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ باقی لوگ بھی کھڑے ہو چکے تھے۔ اُس نے بھی گہرا سانس لیا اور کھڑا ہو کر جیپ کی جانب بڑھ گیا۔

''یہ تم کل ہنسے کس بات پر تھے ؟'' جیپ کی طرف بڑھتے مقدّم نے اچانک ہی نوید کو جا لیا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتے نوید نے بنا رکے اچھنبے سے اسے دیکھا۔

''کس بات پر ؟''

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کس بات پر ؟''

''میرا مطلب میں کس وقت ہنسا تھا ؟'' وہ تو ایسے حیران ہوا کہ مقدّم کو اُسکی یاداشت پر شک گزرنے لگا۔

''انگلیوں پر گن کر تو تم ہنستے ہو، تمہیں خود معلوم ہونا چاہیے کہ تم کب ہنسے تھے ؟'' اُس نے کہا تو نوید نے رک کر اُسے دیکھا۔ وہ بھی رک گیا۔

''پہلیاں نہ بجھواؤ !'' سنجیدگی سے کہا۔

''جب میں نے کہا تھا کہ مارنے کا پلان بنایا ہے ہمیں ؟ تب۔۔۔'' اُس نے یاد دلایا۔

''ہاں تو ! میں یہاں تم لوگوں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں، ایسے میں تم کہو گے کہ میں مارنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں تو میں ہنس ہی سکتا ہوں۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ مقدّم بھی اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

''تم نے ایک چیز نوٹ کی ؟'' حسین نے اُسے سرگوشی میں مخاطب کیا۔

''کیا؟''مقدّم نے پوچھا۔

''اپنی مرضی کا جواب دینے،اور ہر سوال کو نظرانداز کرنے والے ایس ایس پی صاحب نے تمہیں وضاحت دی ہے۔وہ بھی مکمل اور جامع۔۔۔''

''ہاں! یہ تبدیلی میں نے بھی نوٹ کی۔''اس نے تائید کی۔

''یہ تم دونوں آخر نوید کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''عمر نے دونوں کو لتاڑا۔

''خوبصورت آدمی کے پیچھے دنیا ہوتی ہے۔''جواب منطق سے خالی تھا۔پر دینے والا بھی حسین تھا۔ نوید دروازہ کھول کر اپنی نشست پر بیٹھا تو وہاں خاموشی چھا گئی۔ اور اب کہ خاموشی کا دورہ مستقل ہو گیا۔اِس بار راشد نے بھی تنگ نہ کیا۔نہ دوبارہ باقی سب کے درمیان کوئی بات ہوئی۔سب ہی کسی نہ کسی خیال میں کھوئے خاموش سے بیٹھے تھے۔کھڑکی سے باہر نظر آتے پہاڑوں کو دیکھتے علی کا ذہن بھٹکنے لگا۔اور بھٹکتے بھٹکتے پھر تین روز پیچھے پہنچ گیا۔

وہ اپنا سامان گاڑی میں رکھ چکا تھا۔آخری بار سفیر صاحب سے ملا،پھر نشمیہ سے۔

''اگر تم روؤ گی نہیں! تو میں واپس آکر تمہیں ایک سرپرائز دوں گا۔''اُس نے نشمیہ کو خود میں بھینچتے ہوئے کہا۔جانتا تھا کہ وہ رو رو کر خود کو ہلکان کر لے گی۔

''آپ نہیں جائے نا!''اُس نے آنکھیں ملتے،منہ بسورتے کہا تو اُس نے جھک کر اُسکے گالوں پر پیار کیا۔

''میرا دل کا ٹکڑا! بابا کو کام ہے نا! ورنہ نہیں جاتا میں کبھی بھی۔۔۔''سچ تو یہ تھا کہ نشمیہ کو چھوڑ کر جانے پر اُسکا دل بھی راضی نہ تھا۔پر حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔

''اچھا اب رونا بند کرو!''علی نے کہتے ہوئے اُسے خود سے الگ کیا پھر اُسکے چہرے سے آنسو صاف کیے۔

''تمہارا ڈرائیور کچھ کہہ رہا ہے۔میں دیکھتا ہوں!''سفیر صاحب لان کی طرف دیکھتے باہر گئے۔

''اپنا خیال رکھنا احمد!''اُس نے قریب کھڑے احمد کو دیکھتے پیار سے کہا۔

''بابا!''اُس نے ہچکچاتے ہوئے علی کو پکارا تو اُس نے احمد کو دیکھا۔ وہ اب بھی گھٹنوں کے بل نشمیہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''ہاں! کہو!''علی نے نرمی سے کہا۔

''مجھے۔۔۔مجھے کچھ کہنا تھا۔۔۔''وہ کوشش کر رہا تھا۔

''کہو!''علی نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے ساتھ لگایا تو اُسکی آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگے۔

''بابا! میں آپکو مس کروں گا۔''اُس نے کہا، اور اگلے ہی لمحے علی کے گلے لگ کر بلک بلک کر رو دیا۔

''اح۔۔مد۔۔۔''علی گڑ بڑا گیا۔

''کیا ہوا بیٹا؟''اُس نے نشمیہ کو چھوڑ کر اُسے خود میں بھینچا، پھر اُسکی پیٹھ سہلاتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ وہ روتا نہیں تھا، ایسے تو کبھی نہیں۔۔۔

''میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔''اُس نے روتے ہوئے کہا۔ ''آپ واپس آئیں گے تو ہم کرکٹ کھیلیں گے۔''اُس نے کرکٹ کہا، فٹبال نہیں۔۔۔یقیناً رضا کا پڑھایا سبق تھا۔ پر اُس نے اپنے اوپر اپنے باپ کی پسند کو ترجیح دی۔ علی ہنسا، پھر اُسکا سر چوما۔

''کرکٹ کیوں؟ ہم فٹبال کھیلیں گے۔''اُس نے پوچھا۔ تو احمد نے اُسکے کندھے سے سر اٹھاتے ہوئے آنسو صاف کیے اور بولا۔

''آپ کو فٹبال نہیں آتی نا!''علی دل کھول کر ہنسا۔

''تم سکھا دینا نا مجھے۔''اُس نے کہا تو وہ بھی ہنسا، علی کو اُس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔''اُس نے ایک بار پھر احمد کو ساتھ لگایا۔

''پر آپ مجھ سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔''نشمیہ کو یکدم ہی احساس ہوا کہ اسکا باپ اُسکی موجودگی بھول گیا ہے، تو فوراً یاد دلانا ضروری سمجھا۔ علی نے ہنستے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اسے بھی اپنے ساتھ لگایا۔

''نہیں ! میں دونوں سے پیار کرتا ہوں۔''اُس نے باری باری دونوں کا ماتھا چومتے کہا۔اُسکی کائنات مکمل تھی۔۔۔شاید دور کھڑی فاطمہ کی بھی۔۔۔دونوں کو سمجھا بجھا کر وہ کھڑا ہوا تو دور کھڑی فاطمہ پر نگاہیں پڑی۔دل تڑپا۔۔۔

چاہا کہ اُسے بھی پاس جا کر تسلی دے، پر نہیں کر سکا۔۔۔فاصلے بہت تھے۔

''اپنا خیال رکھنا، ڈاکٹر کے پاس فالواپ کے لیے جاتی رہنا، دوائیں وقت پر لینا۔اور۔۔''وہ اُسے کہتے کہتے رکا۔

''اور؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''اور میرا امان مت توڑنا!''اُس نے کہا تو فاطمہ نے نم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔وہ اُسے خدا حافظ کہہ کر، ایک آخری بار بچوں کو چوم کر جانے کے لیے پلٹ گیا۔

وہ ماضی کی دنیا سے باہر آیا تو پہاڑوں پر شام اتر چکی تھی۔نوید کے مطابق اندھیرا ہونے تک وہ لوگ اپنی منزل تک پہنچنے والے تھے۔ہر کوئی خاموش تھا، سفر کے اس آخری مرحلے میں جیسے ایک سکوت سا چھا گیا تھا۔ایسی جامد خاموشی اُتر آئی تھی کہ سانسوں کی آوازیں اور دل کی دھڑکنیں تک سنائی دیں۔اس بار تو راشد بھی مکمل خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

سامنے والی نشست پر بیٹھا نوید باہر دیکھ رہا تھا۔پہاڑوں کا سفر آدمی کو جہاں تر و تازہ کرتا ہے، وہیں ایک عجیب سی اُداسی بھی دل میں بھر دیتا ہے۔ان اونچے، دیو قامت پہاڑوں کو دیکھ کر جہاں دل قدرت کی رعنائیوں کا متعارف ہوتا ہے، وہیں ایک عجیب سی وحشت بھی دل میں اترنے لگتی ہے۔ایسا لگتا ہے شہر کی رونقیں، شور شرابے، مصروف سی زندگی کوئی خواب ہو گئی ہو۔اب فقط ہم ہوں اور یہ پہاڑ ہوں۔ ٹھنڈی ہوائیں ماتھے پر آئے نوید کے بال بکھیر رہی تھی۔اُسکے دل و دماغ اس وقت بشریٰ کی یاد سے پر تھے۔اُسکی روتی آنکھیں، سسکتا وجود، وہ اب بھی اپنے آس پاس محسوس کر سکتا تھا۔اُسکی خاموش التجا، جیسے کہہ رہی ہو کہ نہ جاؤ۔اب بھی سنائی دے رہی تھی۔اُس نے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔پہلی بار اُسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اُس نے یہاں آنے کا فیصلہ غلط کیا ہو۔اسے بشریٰ کو اکیلے چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔وہ کوئی اور طریقہ بھی نکال سکتا تھا۔

پر اب یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔۔۔

اب تو وہ اُسے دور چھوڑ کر آ چکا تھا۔۔۔

نوید کا سر درد کرنے لگا تو آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ بشریٰ اُسکے ساتھ نہ ہو کر بھی ہمیشہ ساتھ ہوتی تھی۔

منزل اب کچھ دور ہی رہ گئی تھی۔۔۔

بالآخر یہ طویل سفر اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا۔۔۔

اختتام؟ یا یہ آغاز تھا۔۔۔

----------+---------+--------

دھپ کی آواز کے ساتھ بیگ زمین پر رکھا گیا تھا۔ بیگ کے نیچے بہت سے سوکھے پتّے چر چرا کر خاموش ہوئے اور کچھ اُنکے قدموں کے نیچے بھی۔ مغرب ہو چکی تھی، اندھیرا چار سو چھانے لگا تھا، کوئی روشنی تھی بھی تو بس آسمان پر نیلاہٹ کی شکل میں اور اِس اندھیرے میں انکے سامنے وہ حویلی پوری شان سے کھڑی تھی۔ ساروں نے سامان زمین پر رکھ کر، اُس آسمان کو چھوتی اندھیری حویلی کو دیکھا تھا۔

اسکردو پہنچ کر نوید نے راشد کو فارغ کر دیا تھا اور وہ تو جیسے بھاگنے کے ہی چکر میں تھا۔ پیسہ لیتے ہی یہ جا وہ جا۔ پھر نوید اُنہیں حویلی تک پیدل لایا، یہ بطور احتیاط تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈرائیور کو بھی انکے قیام کی جگہ معلوم ہو۔ حویلی آبادی سے ہٹ کر کافی اونچائی پر تھی۔ اُسکے لیے انھیں ٹھیک ٹھاک چڑھائی چڑھنی پڑی تھی۔ دل ہی دل میں نوید کو کوستے اور خود کو یہ یقین دلاتے کہ یہ آخری دشواری ہے اِسکے بعد وہ اپنی منزل پر ہونگے، اُن سب نے پہاڑ چڑھ ہی لیا۔ اور اب وہ حویلی کے سامنے کھڑے تھے۔

”ہم اُس قاتل سے بچ کر اس آسیب زدہ بنگلے میں رہنے آئے ہیں؟“ حسین نے کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے، ہانپتے ہوئے حویلی کو دیکھا تھا۔

”تم سے کس نے کہا کہ یہ آسیب زدہ ہے؟“ مقدّم نے پوچھا۔

”اِسکو دیکھ کر ہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔“

''ہم باہر کیوں کھڑے ہیں؟'' علی نے حویلی کے قدیم شاہی طرز کے محرابی دروازوں پر، جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے نوید کو دیکھتے پوچھا۔ ہوااب الٹی سمت سے چلتی، اُسکے بال بکھیر رہی تھی۔ اِس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا، ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا، کندھوں پر رومال ڈالے اور سر پر نماز کی ٹوپی لگائے بھاگتا ہوا آیا۔

''معاف کرنا بھائی! مجھے دیر ہوگئی۔ مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا۔'' لڑکے نے آتے ہی کہا اور جیب سے چابیوں کا گچھا باہر نکال کر دروازے پر لگا بڑا سا تالا کھولنے لگا۔ نوید ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا، ہواؤں کے جھکڑ تیز ہونے لگے تھے۔ مٹی کا طوفان آنے والا تھا شاید۔ لڑکے نے تالا کھولنے کے بعد بڑی سی کنڈی کو زور لگا کر کھولا، پھر دروازے کو دھکّا دیا تو وہ دیو قامت دروازہ، جسکے دو پٹ تھے، زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ اُسکی آواز سارے میں گونجی اور ساتھ آسمان پر کہیں ہلکی سی بجلی بھی چمکی تھی۔

''آپ لوگ آجائیں اندر، میں لائٹ جلاتا ہوں۔'' وہ اُنہیں کھلے دروازے سے اندر جانے کا بول کر خود حویلی کے پیچھے کی جانب چل دیا۔

''کیا ہمیں اندر جانا چاہیے؟'' عمر نے دروازے سے اندر نظر آتی، اندھیرے میں ڈوبی حویلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں آجاؤ! وہ لائٹ کھول دے گا اتنی دیر میں!'' نوید نے جواب دیتے موبائل کا ٹارچ جلایا اور اندر کی طرف قدم رکھے، اُسکے پیچھے وہ لوگ بھی باری باری اندر کی طرف بڑھے۔ باقیوں میں سے بھی ایک دو نے موبائل کا ٹارچ جلا لیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں حویلی کے اندر رکھے قدیم طرز کے فرنیچر عجیب ہیبت ناک سے لگ رہے تھے۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ ہم کسی ہارر مووی کی طرح یہاں پھنسنے والے ہیں۔'' آس پاس ٹارچ کی روشنی مارتے حسین نے پوچھا۔ نوید خاموشی سے کھڑا ٹارچ کی روشنی میں آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ہاں! جیسے اس گھر میں انگریزوں کے زمانے میں خوب قتل وغارت گری ہوئی ہو اور پھر تب سے یہ گھر آسیب زدہ بن گیا ہو۔'' مقدّم نے از راہِ مذاق اُسکا جملہ مکمل کیا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' گھر کا جائزہ لیتے نوید نے رک کر اچھنبے سے پوچھا تو سب کو سانپ سونگھا۔

''کک۔۔۔ کیا مطلب؟'' علی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہاں واقعی قتل و غارت گری ہو چکی ہے؟''کافی دیر سے خاموش رضا نے تشویش سے پوچھا۔

''انگریزوں کے دور میں ایسا بہت سے خاندانوں کے ساتھ ہوا ہے۔کوئی نئی بات نہیں ہے۔''اُس نے کندھے اُچکاتے ایسے کہا جیسے واقعی کوئی بات ہی نہ ہو۔اُنکے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''میں واپس جارہاہوں۔''حسین نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے بیگ واپس کندھوں پر ڈالااور دروازے کی جانب قدم بڑھادیئے۔

''جنات کے ہاتھوں مرنے سے اچھاہے، میں اُس پراسرار قاتل کے ہاتھوں مارا جاؤں۔''وہ ابھی دروازے سے تھوڑا دور ہی تھا کہ ہوا کا زوردار جھکڑ چلااوراس مرتبہ رفتارا اتنی تیز تھی کہ نہ صرف آس پاس رکھا کچھ سامان نیچے گرا تھا، بلکہ دیو قامت دروازے بھی پوری قوت کے ساتھ دھاڑ سے بند ہوئے تھے۔عمر نے دہل کر دروازے کی جانب دیکھا، حسین خوفزدہ انداز میں اُلٹے قدموں واپس آیا، رضا نے بیساختہ اپنے برابر میں کھڑے شخص کا ہاتھ پکڑ لیا۔اسی اثنا میں باہر زوردار بجلی چمکی، جس نے حویلی کی کھڑکیوں سے اندر آنے کا راستہ بنایا اور لمحے کو گلابی روشنی نے سارا گھر روشن کیا، اور پھر معدوم ہو گئی۔

''یار! یہ بندہ لائٹ آن کرنے گیا تھا، کہاں چلا گیا ہے؟''مقدّم نے گھبرا کر پوچھا۔بادل باہر زور سے گرجے تھے۔

''تم لوگ اِتنااوورریکٹ کیوں کررہے ہو؟طوفان ہی ہے بس!''نوید کی بیزار آواز کانوں میں پڑی تو سب نے اندھیرے کے باوجود اُسکی طرف منہ موڑا۔

''اوورریکٹ؟تم نے ہمیں یہاں اس آسیب زدہ، انگریزوں کے دور کا خونریزی کا مرکز، جنات کے ڈیرے والے گھر میں لا کھڑا کیا ہے۔اور ہم اوورریکٹ کررہے ہیں؟''حسین نے صدمے سے کہا تھا۔ہوائیں تیز ہورہی تھیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک میں مستقل اضافہ ہو رہا تھا۔

''کچھ بھی نہیں ہے اس گھر میں ایسا، یہاں کے مکین سالانہ چھٹیاں گزارنے آتے ہیں اور مہینے دو مہینے قیام کرتے ہیں۔کبھی کچھ نہیں ہوا۔''نوید نے اب کہ اُسے سمجھانا چاہا تھا۔

''تمہیں یہی جگہ ملی تھی چھپنے کے لیے؟''عمر نے پہلی بار اعتراض کیا تھا۔آسمان پر دھماکہ ہوا تھا جیسے۔۔۔

”یہ جگہ میں نے نہیں! فرّخ صاحب نے چنی ہے۔“اُس نے پہلی بار وضاحت دی۔اسی لمحے بجلی کھول دی گئی۔ بجلی کا کھلنا تھا کہ ساری کی ساری حویلی روشنی میں نہا گئی۔سب نے آنکھیں پھاڑ کر آس پاس دیکھا تھا۔وہ لوگ حویلی کے لاؤنج کے عین وسط میں کھڑے تھے۔

لاؤنج کسی قدیم محل کے مرکزی ہال کی مانند تھا، ہلکے سنہری اور بھورے سنگِ مرمر کے فرش پر نقش ونگار بنے تھے۔عین وسط میں ایک گول، نفیس لکڑی کی میز رکھی تھی، جس پر نقلی پھولوں کا بڑا سا گلدستہ سجا ہوا تھا۔ہال کی دونوں جانب سے دو عظیم الشان سیڑھیاں، نیم دائرے کی شکل میں اوپر کی طرف اٹھ رہی تھی۔سیڑھیوں کی ریلنگ سیاہ لوہے سے بنی تھی، جس پر نفیس بیل بوٹوں کی کاریگری کی گئی تھی،اوپر کی منزل پر ایک کشادہ بالکونی سیڑھیوں کے دونوں سروں کو آپس میں جوڑ رہی تھی، جس کی ریلنگ بھی اسی طرز کی کاریگری سے مزین تھی۔اس بالکونی کے پیچھے طویل راہداری نظر آرہی تھی۔ چھت بلند اور لکڑی کی نفیس تراش خراش سے بنی تھی، جس کے عین وسط میں لٹکتے شاندار فانوس کی روشنی پورے ہال کو گرم اور مدھم سنہری روشنی سے بھر رہی تھی۔ دیواروں پر لگے کلاسیکی طرز کے دیوار گیر چراغ،اس روشنی میں مزید اضافہ کر رہے تھے، یہ حویلی اندھیرے میں جتنی ہیبت ناک تھی،روشنی نے اُسکے حسن میں اتنا ہی اضافہ کر دیا تھا۔اور یہ تو فقط ہال تھا۔نامعلوم باقی حویلی کیسی شاہکار تھی؟ وہ لوگ مبہوت سے اُس ہال کی خوبصورتی کو دیکھ رہے تھے کہ اُسی لمحے دیو قامت محرابی دروازہ جو ہوا سے بند ہو گیا تھا،وہ تیزی سے کھلا۔سب نے چونک کر اُس جانب دیکھا تو وہی لڑکا اندر آرہا تھا۔

”سوری بھائی! اندھیرا ہونے کی وجہ سے فیڈر کھولنے میں وقت لگ گیا۔“اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تو سب جیسے کسی سحر سے باہر آئے۔حویلی کی خوبصورتی نے واقعی طلسم ساطاری کر دیا تھا۔رضا نے چونک کر اپنے ہاتھ کو دیکھا تو خود کو علی کا بازو پکڑے پایا۔ اندھیرے میں گھبرا کر اُس نے اپنے برابر کھڑے جس شخص کا سہارا لیا تھا وہ علی ہی تھا۔جلدی سے اُسکا بازو چھوڑ کر ایسے دور ہوا جیسے کسی نے دیکھ لیا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے؟ خیر کوئی کیا ہی دیکھتا؟ خود علی نے اِس وقت کچھ بھی محسوس نہ کیا کہ وہ پہلے خوف، پھر ہال کی خوبصورتی ملاحظہ کرنے میں محو تھا۔دیکھ لیتا تو یہاں ایک نئی جنگ چھڑ چکی ہوتی یقیناً!

”کوئی بات نہیں! تم باقی چیزیں دیکھ کر بتادو۔“نوید نے اُسے سنجیدگی سے دیکھتے کہا۔

”اوپر والے بیڈ روم کے دروازے کھلے ہیں، میں نے صبح ہی صفائی کروادی تھی، باورچی خانے میں مہینے کا راشن اور کھانے پینے کا سامان بھی موجود ہے۔باقی سامان میرے گھر کے فریج میں ہے، کیونکہ یہاں کا فیڈر بند ہونے کی وجہ سے فریج نہیں چل رہا تھا۔میں کچھ دیر میں لے

آؤں گا۔ رات کا کھانا بھی میری والدہ نے بنایا ہوا ہے آپ لوگوں کے لیے۔ میں وہ بھی ساتھ میں لیتا آؤں گا۔ گیزر چل رہا ہے، اسلیئے پانی بھی گرم ہے۔ آپ لوگ جب تک اپنا سامان وغیرہ رکھ کر تازہ دم ہو جائیں۔‘‘ اُس نے بڑے ادب سے تمام تفصیلات بتائی تھیں۔ بہت ہی مہمان نواز اور باادب لڑکا تھا۔

’’تمہارا نام؟‘‘ نوید نے اُسکا نام پوچھا۔

’’اکرم!‘‘

’’شکریہ اکرم!‘‘ اس نے نرمی سے اُسکا شکریہ ادا کیا تو وہ خوش ہو گیا۔

’’شکریہ کس بات کا جی؟ یہ تو میرا کام ہے۔ آپکو مزید کسی شے کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا، میں پیچھے انیکسی میں رہتا ہوں۔ یہ میرا نمبر رکھ لیجئے۔‘‘ اُس نے ایک کاغذ آگے بڑھاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ایک بات تو ماننے والی تھی کہ یہاں کہ لوگ بے حد مہمان نواز اور پر خلوص تھے۔ پیچھے چلّم چوکی کے پاس جب جیپ کو حادثہ پیش آیا تھا، تب بھی لوگوں نے بنا کسی جان پہچان بہت مدد کی تھی، ڈھابے کے مالک نے بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور اب یہ لڑکا۔ نوید نے اثبات میں سر ہلاتے اُس سے کاغذ لے لیا اور موبائل میں نمبر فیڈ کرنے لگا، جبکہ اکرم جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔ باہر طوفان زور و شور پر تھا، ساتھ بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔ پر بجلی بحال ہونے کے بعد خوف کا اثر زائل ہونے لگا تھا۔

’’اوپر تین کمرے ہیں، بقیہ کمرے استعمال کرنے کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔‘‘ ہال میں نوید کی سنجیدہ آواز گونجی۔

’’یعنی دو لوگوں کو ایک کمرے میں رہنا ہے۔ وہ پہلا دروازہ جو سامنے ہی سیڑھیوں کے اختتام پر نظر آرہا ہے۔ وہ پہلا کمرہ ہے، اُس سے آگے راہداری میں مزید کمرے موجود ہیں۔‘‘ اُس نے دائرے کی صورت اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو سب نے بیساختہ اوپر کی جانب دیکھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر جو بالکنی تھی، اُس سے اندر طویل راہداری جاتی دکھائی دے تھی، راہداری کے شروعات پر پہلا دروازہ تھا، اُس سے آگے بقول نوید کے مزید بھی تھے۔ وہ یقیناً اس حویلی کے بارے میں پہلے سے معلومات رکھتا تھا۔

’’پہلا کمرہ، عمر اور مقدّم تم دونوں کا ہے۔‘‘ اُس نے کہا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''درمیان میں کچھ کمرے چھوڑ کر ایک کمرہ اور کھلا ہے، پھر مزید کمرے چھوڑ کر آخر میں ایک کمرہ ہے، جو میں نے اپنے لیے رکھا ہے، کیونکہ وہاں سے میں باہر کے راستے پر نظر رکھ سکتا ہوں۔ حسین اُس کمرے میں میرے ساتھ ہی رہے گا۔''اُس نے سکون سے کہا۔سب نے اُسکی بات کو غور سے سنا، سمجھا اور پھر ردعمل کے طور پر سب کی نظروں نے ایک ساتھ علی اور رضا کا رخ کیا۔جبکہ وہ دونوں خود نوید کا منہ دیکھ رہے تھے۔

''اِس بات کا کیا مطلب؟''علی نے اچھنبے سے پوچھا۔

''اتنی آسان بات کا بھی کوئی مطلب ہوتا ہے؟''نوید نے اُس سے بھی زیادہ اچھنبے سے پوچھا تھا۔

''یعنی میں تمہارے ساتھ کیوں رہوں؟ علی کو یہ پیشکش کیوں نہیں کر رہے تم؟''بقیہ سوال حسین نے مکمل کیا تھا۔نوید نے گہرا سانس بھر کر براہِ راست حسین کو دیکھا۔

''کیونکہ میں تمہیں اپنی من مانیاں کرنے کے لیے گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔بہتر ہے کہ تم میری نظروں کے سامنے ہی رہو۔''اس جواب پر جہاں حسین کا منہ کھلا تھا، وہیں مقدّم اور عمر نے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔ علی اور رضا تو ابھی پہلے صدمے سے ہی باہر نہیں نکلے تھے۔

''کیا مطلب من مانیاں؟تمہارے خیال میں کیا کرنے والا تھا میں یہاں؟''حسین نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''اپنے اپنے سامان لیکر کمروں میں آجاؤ!اکرم رات کا کھانا لیکر تھوڑی دیر میں آجائے گا۔''ایس ایس پی صاحب نے ایک مرتبہ پھر سوال نظرانداز کیا اور سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔پیچھے حسین نے دانت کچکچائے، کتنا زبردست منصوبہ بنایا تھا اُس نے رات کو اٹھ کر حویلی کا جائزہ لینے کا، مگر ایس ایس پی صاحب اُسکی سوچ سے زیادہ شاطر تھے۔

''یہ ہے کون ہمارے متعلق فیصلہ کرنے والا؟''پہلی بار رضا کو تپ چڑھی تھی۔ حسین کا بڑی شدت سے تمہارا سالہ کہنے کو دل کیا، پر اُس نے خود کو باز رکھا۔

''تمہارے متعلق تو اُس نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ہاں مگر۔۔۔''مقدّم کہتے کہتے رکا تو حسین نے اس غدّاری پر اُسے گھورا۔

''مگر؟''عمر نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ان دونوں میں سے صبح تک کوئی ایک ہی زندہ بچے گا۔''اُس نے رضا اور علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اِس بار عمر اور حسین نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش ہر گز نہیں کی تھی۔ جبکہ علی نے اُسے سنجیدہ نظروں سے گھورنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''آہ! زندہ بچنے والے میں، میں تو ہر گز نہیں ہو سکتا۔''رضا نے اپنا بیگ اٹھا کر کندھوں پر ڈالتے ہوئے سرد آہ بھری۔

''کیوں؟ میں قاتل ہوں تمہارے خیال میں؟''علی نے طنزیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''نہیں! تم قاتل نہیں ہو۔ لیکن چونکہ میں عادی نشئی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ رات کو اپنے شوق کے لیے نشہ کر کے سو جاؤں، تو مجھے بھلا کیا ہی خبر کہ کون مجھے قتل کر رہا ہے اور کون نہیں؟''اُس نے کہاں کا بدلا کہاں نکالا تھا؟ جہاں علی کا چہرہ تاریک ہوا تھا وہیں باقی تینوں کے چہروں سے بھی مسکراہٹ اُڑن چھو ہوئی تھی۔ جبکہ رضا اُسی طرح مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھتا، کسی کا بھی ردعمل دیکھے بنا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا، علی کے چہرے پر الگ شرمندگی در آئی تھی۔

''میں بھی جا رہا ہوں۔''عمر نے اُس غیر آرام دہ سی خاموشی سے بچنے کے لیے آہستگی سے کہا اور وہ بھی اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اُسکے پیچھے مقدّم اور حسین بھی چلے گئے۔ جبکہ علی نے سب سے آخر میں اپنا سامان اُٹھایا تھا۔

جو ابھی ابھی رضا کہہ کر گیا تھا، اُسکے بعد اُسکا سامنا کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔

----------+---------+--------

''تمہارا شکریہ!''عمر نے کھانے کی ٹرے اکرم کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ کیسا؟ یہ میرا کام ہے۔''ہمیشہ کی طرح وہ مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ کیونکہ راہداری میں پہلا کمرہ عمر اور مقدّم کا تھا اِس لیے پہلے وہ اُنہیں ہی کھانا پہنچانے آیا تھا۔ یہ مہربانی صرف آج رات کے لیے تھی، کیونکہ آج وہ لوگ تھکے ہوئے تھے اور سامان بھی سیٹ کرنا تھا، لہٰذا آج نوید کے حکم پر سب کو کمرے میں ہی کھانا پہنچا دیا گیا تھا۔ کل سے ایسی کوئی عیاشی نہیں ہونی تھی۔

''آجاؤ! کھانا کھا کو۔'' عمر نے کمرے میں رکھی چھوٹی سی میز پر ٹرے کو رکھتے ہوئے مقدّم کو مخاطب کیا، جو اپنے بیگ کا سارا سامان اپنے پلنگ پر پھیلائے یہی سوچ رہا تھا کہ اُسے ترتیب کیسے دے؟

''ہاں! تم شروع کرو میں آتا ہوں۔'' اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ عمر نے شروع کرنے بجائے اسکا انتظار کرنا مناسب سمجھا، لہٰذا پاؤں پسارے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ جتنا مبہوت وہ لوگ ہال کو دیکھ کر ہوئے تھے، راہداری اور کمرے میں آ کر معلوم ہوا کہ وہ تو فقط ابتدائی مہمان نوازی جیسا ایک ٹریلر تھا۔ اصل خوبصورتی تو یہاں تھی۔

جس راہداری میں یہ کمرے بنے وہ کافی طویل تھی۔ سفید رنگت کے دیوار سے ذرا سا اُبھرے ہوئے ستون پر منقش سنہری نقش و نگار اور اِن دیواروں کے سینے پر بڑے بڑے سنہری فریموں میں جڑی تصویریں آویزاں تھیں، سپید و سیاہ رنگوں کی یہ پورٹریٹ ان لوگوں کی تھیں، جو یقیناً کبھی اس محل یا حویلی کا غرور رہے ہوں گے۔ ایک تصویر میں ایک باوقار شخصیت، شاید کوئی بلند مرتبہ فوجی افسر، اپنے تمغوں اور وردی کے ساتھ ایستادہ تھے، اس کے پہلو میں دوسری تصویر خوبصورت خاتون کی تھی، اور ایسے ہی بہت سے پوٹریٹ ایک قطار میں راہداری کے آخر تک جا رہے تھے۔

دیواروں پر نصب برقی قندیلوں (Sconces) کی سنہری روشنی سے ماحول میں ایک پُراسراریت پیدا ہو رہی تھی۔ روشنی اور سائے کا یہ کھیل تصویروں کے چہروں کو ایسا تاثر دے رہا تھا، جیسے وہ ابھی فریم سے باہر نکل کر اپنی داستانِ حیات سنانے لگیں گے۔ لکڑی کے چمکدار فرش پر پڑتی مدھم Sconces کی روشنی نے فرش کی چمک دمک میں اضافہ کر دیا تھا۔

راہداری سے اندر عمر اور مقدّم کے کمرے میں آؤ تو وہ اُسکی دیواریں گہرے رنگ کی نفیس لکڑی سے آراستہ تھیں، جن پر باریک نقش و نگار تراشے گئے تھے۔

کمرے کے ایک طرف دو خوبصورت سنگل بیڈ ایک دوسرے کے متوازی رکھے ہوئے تھے۔ بستر پر گہرے خاکی اور بھورے رنگ کی چادریں بڑی ترتیب سے بچھی ہوئی تھیں، ہر بستر کے پاؤں کی جانب ایک چھوٹی سی upholstered بنچ رکھی تھی، جس پر نرم کپڑا اچڑھا ہوا تھا۔ دونوں بستروں کے درمیان ایک چھوٹی مگر نفیس لکڑی کی سائیڈ ٹیبل تھی، جس پر ایک کلاسیکی طرز کا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا، عمر نے لیمپ کے برابر میں ہی کھانے کی ٹرے رکھ دی تھی۔

کمرے کی دوسری سمت ایک بڑی اور بلند محرابی کھڑکی تھی، جس کے شیشوں سے باہر برستی بارش واضح نظر آرہی تھی۔ کھڑکی پر بھاری اور گہرے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے، جو آدھے سرکائے گئے تھے۔ کھڑکی کے برابر میں ہی اسی طرز کی دو الماریاں رکھی تھیں۔

کھڑکی کے نیچے ایک پرانے طرز کا ریڈی ایٹر لگا ہوا تھا، جبکہ ساتھ ہی ایک لکڑی کی میز بھی تھی، جس پر چند سجاوٹی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے فرش پر پالش شدہ لکڑی کی تختیاں بچھی ہوئی تھیں۔

ہر چیز میں ایک ترتیب، ایک سکون اور ایک قدیم وقار جھلکتا تھا۔ اس حویلی کے انٹیریئر نے عمر کو بے انتہا متاثر کیا تھا، وہ اس نوعیت کا فن اپنی آنکھوں سے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ایک آرٹسٹ کی نظروں سے اِس پورے کمرے اور راہداری کا جائزہ لیا تو وہ اِس شاہکار کو تخلیق کرنے والے اُن کاریگروں کو داد دیئے بنا نہ رہ سکا، جنھوں نے اس باریک بینی سے اسے تخلیق کیا تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی نقص یا کمی بیشی نہیں مل رہی تھی۔ اِس قسم کے انٹیریر اور فرنیچر کا وہ پرستار تھا۔

''لگتا ہے تمہارے اندر کا انٹیریئر ڈیزائنر جاگ گیا ہے۔'' اپنے کپڑوں کو ترتیب سے تہہ کرتے، مقدّم نے اُسکا دماغ پڑھا تو وہ ہنسا۔

''ہاں! میں نے اس قسم کے ڈیزائنز کے بارے میں پڑھا تو بہت ہے، پر آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق پہلی دفعہ ہوا ہے۔''

''تو کیا کہتے ہیں اس ڈیزائن کو؟'' وہ کپڑے پلنگ پر چھوڑ کر میز کی جانب والی طرف آکر بیٹھ گیا، اس طرح کے عمر اب اُسکے سامنے تھا۔

''تم اندازہ لگاؤ۔'' عمر نے ٹرے پر سے سامان الگ الگ کرکے اٹھاتے ہوئے، اُس سے پوچھا۔

''میں بھلا مانس آڈیٹر ہوں، بھلا مجھے ان سب چیزوں سے کیا لینا دینا؟ لیکن میرے دماغ میں اسکا ایک نام آرہا ہے۔'' اُس نے پلیٹ میں رکھے چاولوں کو چمچ کی مدد سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' عمر نے پوچھا۔

''ہیری پوٹر کا ہوگوارٹس۔۔۔'' اس بات پر وہ دل کھول کر ہنسا۔ ڈارک براؤن لکڑیوں سے بنا انٹیریئر اور اُس میں سنہری روشنیاں ہوگوارٹس جیسی ہی تھیں۔

''ویسے کچھ کچھ تم نے صحیح کہا۔'' عمر نے نوالہ منہ میں ڈالتے کہا۔ ''یہ انٹیریئر روکوکو(rococo) اسٹائل کا ہے، جبکہ فرنیچر وکٹورین یعنی انیسویں صدی کے برطانوی اسٹائل کے ہیں، جبکہ یہ کھڑکیاں اور دروازے گوتھک روائیول(GothicRevival) طرز کے ہیں۔ کل ملا کر یہ تین قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار ہیں۔ آج کل یہ اسٹائل ناپید ہو چکے ہیں۔'' عمر نے تفصیلاً بتایا۔

''کھانا اچھا ہے۔'' اُسکا جواب بڑا ہی غیر متوقع تھا۔ عمر ایک بار پھر ہنسا۔

''سیدھے سیدھے کہو تم بور ہو رہے ہو۔''

اُن دونوں کو کھانے میں مشغول چھوڑ کر باہر راہداری میں آئیں تو وہ اس وقت سنسان پڑی تھی۔ دیواروں پر لگے پوٹریٹ میں موجود لوگ جیسے آنے والوں کو ہی گھور رہے تھے۔ عمر اور مقدّم کے کمرے کے دروازے کو چھوڑ کر راہداری میں تھوڑا آگے کی طرف بڑھا جائے تو درمیان میں تین مزید دروازے بند پڑے تھے، اُنہیں چھوڑ کر چوتھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں رضا اپنا سامان الماری میں سیٹ کر رہا تھا۔ دوسری جانب فن کا دلدادہ علی سفیر کمرے کے ایک ایک کونے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''قدیم روکوکو اسٹائل کا انٹیریر، وکٹورین طرز کا فرنیچر اور گوتھک ریوائیول کی جھلک۔۔۔ انگریزوں کا فنِ تعمیر بھی بڑا خوبصورت ہے ویسے۔'' ٹراوزر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے علی نے سامنے دیوار پر بنے نقش و نگار کو دیکھتے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔ اُسکی واضح بڑبڑاہٹ پر رضا نے ایک نظر اُس پر ڈالی پھر الماری بند کر کے واپس اپنے پلنگ کی جانب آیا۔ علی اُس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا، پر مل نہیں رہا تھا۔ نہیں وہ شرمندہ نہیں تھا۔۔۔ نہیں وہ اُسکو دوست بھی نہیں مانتا تھا۔۔۔ لیکن اب اِس شخص کے ساتھ ایک ماہ گزارنا تھا تو بات کرنا بھی ضروری تھا۔ جبکہ اِس گھر میں فلحال انٹرنیٹ کی سہولت بھی نہ تھی، تو وقت گزارنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔

''کیا کہوں اسے؟'' وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ رضا کے مقابلے میں اُس نے اپنا کام جلدی کر لیا تھا، وہ ویسے بھی تھوڑا انفاست پسند طبیعت کا مالک تھا۔ جب تک ایک ایک شے اچھے سے نہ رکھ لیتا سکون نہ آتا، اس لیے پہلے اپنا کام مکمل کر لیا۔ البتہ رضا نے پہلے گھوم پھر کر راہداری میں نظر آنے والی ہر تصویر کا بغور جائزہ لیا، پھر کمرے کا کونا کونا دیکھا اور جب دل بھر گیا تو آخر میں اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ اور اب وہی کام کرنے کی باری علی کی تھی، لہٰذا وہ زور و شور سے کر رہا تھا۔

''میں نے ایسا انٹیریئر آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا۔'' علی نے ایک مرتبہ پھر باآواز بلند کہا۔

''اپنا علم یہاں مت جھاڑو!'' اپنے پلنگ کے برابر رکھی سائڈ ٹیبل پر سے کتابیں ہٹا کر، وہاں نجانے کس شے کے لیے جگہ بناتے، رضا نے سکون سے کہا تو علی نے جھٹکے سے پلٹ کر اُسکو دیکھا۔

''ایکسکیوز می! آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟'' اُس نے بھنویں اُچکا کر اُسے دیکھا۔

''یہاں تم ہی اپنا علمِ تعمیرات و تزئین و آرائش جھاڑ رہے ہو۔ یقین مانو! مجھے اِس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' (واہ! کیا اردو تھی) رضا اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹا۔ البتہ علی کا پارہ حسبِ توقع چڑھ چکا تھا۔

''کیا میں نے تمہیں یہ سب بتایا؟'' اُس نے اُس کے بستر کے پاس آتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ وہ بتا اُسے ہی رہا تھا۔

''اوہ! کیا تم نے مجھے نہیں بتایا؟'' اُس نے بے انتہا حیرت سے پوچھا تو علی نے ضبط کے گھونٹ بھرے۔

''نہیں! ہر گز نہیں! بلا وجہ خوش فہمی نہ پالو کہ میں تم سے مخاطب تھا۔'' اُس نے چبا چبا کر کہتے اُسکی غلط فہمی دور کرنی چاہی۔ رضا ہاتھ میں پکڑی آخری کتاب کو کھڑکی کے نیچے رکھی میز پر رکھ کر پلٹا، اور ذرا مشکوک انداز میں اُسے سر تا پاؤں گھورا۔

''تمہیں ہمیشہ سے اکیلے بات کرنے کی بیماری تھی یا یہاں آکر کوئی اثرات ہو گئے ہیں؟'' اُس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا تھا۔ علی نے سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بیماری کی جگہ عادت کا لفظ بھی تو استعمال کر سکتا تھا نا؟ مگر نہیں! تپانے کا موقع کیوں ضائع کرتا وہ؟ بدتمیز آدمی!

''میری بات سنو! میں اکیلے اکیلے بات کروں، اکیلے اکیلے ہنسوں یا اکیلے اکیلے ناچوں، تمہیں اُس سے کیا؟'' اُس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔ غالباً رضا اُسکا موڈ غارت کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

''آف کورس! مجھے اُس سے کیا؟'' وہ کندھے اُچکا کر کہتا، کھانے کی ٹرے کے پاس آیا، جو اکرم ابھی ابھی کھڑکی کے نیچے والی میز پر رکھ کر گیا تھا۔ ''مگر جب لوگ میرے معاملات، میری ذاتیات، اور میرے ماضی میں مداخلت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تب وہ یہی سوال بھول جاتے ہیں کہ اُنہیں ان سب سے کیا؟'' مزے سے کہتا وہ اپنی پلیٹ لیکر، فق ہوتے چہرے کے ساتھ کھڑے علی پر ایک نظر ڈالتا اپنے

پلنگ پر آبیٹھا۔اب وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، بھنویں سکیڑے، سنجیدہ چہرے کے ساتھ خود کو دیکھتے علی کو بڑی فرصت سے دیکھتا کھانا کھا رہا تھا۔

''میں تم سے معافی مانگ چکا ہوں، وہ بھی سب کے سامنے۔''اُس نے آہستہ مگر سنجیدہ آواز میں کہا اور میز پر رکھی اپنی پلیٹ کی جانب بڑھا۔

''پر میں نے معاف نہیں کیا تھا۔''اُس نے بھی بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ علی پلیٹ اٹھا کر اپنے پلنگ کی جانب آیا، پھر رک کر اُسے دیکھا۔

''پر میں نے تمہیں بنا معافی مانگے ہی معاف کر دیا ہے رضا!''جواب تھا یا کمان سے نکلا زہر آلود تیر۔رضا کے چہرے سے تمام تر مسکراہٹ غائب ہوئی، نوالہ حلق سے اترنا دوبھر ہو گیا۔جبکہ علی کسی بھی قسم کے طنز سے پاک چہرے کے ساتھ اب پوری رغبت سے کھانے سے انصاف کر رہا تھا۔پر رضا اب کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔اُس نے خاموشی سے آدھ کھائی پلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

اور کیا تعلق ہے تمہارا اُس (صنوبر) سے، جس تعلق کی قیمت تم ہم سب سے مانگ رہے ہو؟

اپنے ہی چھوڑے ہوئے طنز کے نشتر اب اُسکے آس پاس گونج رہے تھے۔اُس نے جو غلیظ الزام علی پر لگایا تھا، وہ بھی سب کے سامنے۔کیا وہ اُسکی معافی مانگ سکا تھا اب تک؟اپنے حصّے کے حساب تو سب کو یاد تھے، پر علی کے حساب تو سب نے بھلا دیئے تھے۔اور وہ بھی سب کو حساب دیتے دیتے، اپنے حصّے کے قرض واپس لینا تو بھول ہی گیا تھا یا شاید۔۔۔۔۔اُس نے اپنے تمام قرض معاف کر دیئے تھے۔

ان دونوں کے کمرے سے باہر راہداری ایک مرتبہ پھر خاموش پڑی تھی۔اُنکے ساتھ مزید چار کمرے قطار میں بند پڑے تھے۔یہ راہداری بھی شیطان کی آنت جتنی لمبی تھی۔آخری کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

''آہ!اس سفر میں تو میں ٹھیک سے کھانا بھی نہ کھا سکا تھا۔''کھانے کی پلیٹ خالی کر کے حسین نے اُسے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا تو اپنا سامان ترتیب سے رکھتے نوید نے تاسف سے اُسے دیکھا، جسکا تمام سامان ایک کونے میں بے ترتیب سا بکھرا پڑا تھا۔

نوید کے سامان میں موجود چیزیں بھی عجیب ہی تھیں۔ عجیب عجیب سے اسلحے، پتہ نہیں کون کون سے گیجٹس، جن کے شاید نام بھی حسین کو معلوم نہ ہو۔ وہ ہر شے کو سلیقے سے میز پر سیٹ کر کے، پھر اُس میں انٹرنیٹ کنیکٹ کرنے کے بعد اُنہیں آن کر رہا تھا۔

''میں نے سوچا ہے کہ آج صرف آرام کروں گا۔ باقی کام کل۔۔۔'' حالانکہ نوید صرف اور صرف اپنے کام میں ہی مصروف تھا، لیکن حسین بھی صرف اور صرف اُس سے ہی مخاطب تھا۔ نوید نے اُسے نظرانداز کیا۔

''ویسے تم چاہتے تو علی یہاں رہ سکتا تھا،اور تم دوسرے کمرے سے بھی میری تمام تر نقل وحرکت پر نظر رکھ سکتے تھے۔'' حسین نے اُسکے لیپ ٹاپ کی سکرین میں جھانکتے ہوئے کہا جس پر حویلی کے اندرونی وبیرونی مناظر واضح تھے۔ یعنی وہ سی سی ٹی وی مانیٹر کر رہا تھا۔

''حسین!'' اس نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! کہو!''

''کیا تم خاموش رہو گے؟''

''نہیں!'' دوٹوک جواب دے کر حسین اُٹھا اور الماری کی جانب بڑھا، جسکے پٹ ابھی کھلے ہوئے تھے، غالباً نوید کو اپنا بقیہ سامان رکھنا تھا۔ اُس نے لب بھینچ کر حسین کو دیکھا۔

''مجھے یہاں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔ تم خاموش رہو تو مہربانی ہو گی تمہاری۔۔۔'' اُس نے چبا چبا کر کہا۔

''تو کرو! میں نے کون سا روکا ہے؟'' اُس نے الماری میں ترتیب سے رکھے نوید کے کپڑوں پر نظر ڈالتے بے نیازی سے کہا۔

''ایک بات بتاؤ نوید!'' اب کہ حسین نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ نوید نے بے بسی سے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ میٹنگ شروع ہونے میں فقط چار منٹ تھے۔

''تمہارے پاس انٹرنیٹ کیسے آ رہا ہے؟ ہمیں تو سگنلز تک نہیں ملے۔''

''ڈیوائس سے۔'' اُس نے ضبط سے وائرلیس وائی فائی ڈیوائس کی جانب اشارہ کیا، جس پر ایف آئی اے کا لوگو نصب تھا۔

''یعنی میں نہ ہی سمجھوں پھر؟'' اُس نے لوگو دیکھتے افسوس سے کہا۔

''اسکا پاسورڈ صرف گیجٹس میں فیڈ ہے۔ میرے اپنے موبائل پر بھی انٹرنیٹ نہیں چل رہا۔ صرف سرکاری کاموں کے لیے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔'' پتہ نہیں اُس نے وضاحت کیوں دی؟

''اچھا ایک اور بات بتاؤ!'' حسین نے پوچھا تو نوید نے خون کے گھونٹ بھر کر اُسے دیکھا، دو منٹ باقی تھے میٹنگ میں۔

''تم یہ بیواؤں کی طرح ہر وقت کالا اور سفید رنگ پہن کر کیوں گھومتے ہو؟'' اِس بات پر نوید نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھا، اور راہداری میں جھانکتے ہوئے آس پاس دیکھا۔

''ایک منٹ یہاں آنا ذرا!'' اُس نے حسین کو اِس طرح بلایا جیسے کوئی بہت اہم کام ہو۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے دروازے کے پاس آتے ہوئے پوچھا اور باہر جھانکا۔

''وہ دیکھو! وہ رضا ہے کیا؟'' اُس نے اشارہ کیا۔

''کہاں؟ مجھے تو کہیں نہیں دکھ رہا۔'' وہ ذرا دروازے سے باہر کی جانب ہوا۔

''اب جب تک میٹنگ ختم نہیں ہو جاتی، باہر ہی رہو۔'' اِس سے پہلے کہ حسین کچھ بھی سمجھتا نوید نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے نوید؟'' اُس نے غصّے سے دروازہ کھٹکھٹایا، پر جواب ندارد۔

''دیکھ لوں گا تمہیں میں!'' اُس نے پلٹتے ہوئے کہا، پر سنسان راہداری اور دیواروں پر لگی تصاویر دیکھ کر اُسکی تمام تر ہمت ہوا ہوئی۔

راہداری کے درمیان میں علی اور رضا کے کمرے کے بند دروازے کے اندر نظر ڈالیں، تو دونوں اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بارش باہر زور و شور سے جاری تھی، ساتھ میں بجلی بھی زوردار انداز میں کڑک رہی تھی۔ محرابی کھڑکیوں سے بجلی کی کڑکتی روشنیاں اندر آ رہی تھیں۔ ٹھنڈ بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ جیکٹ اور موزے پہننے کے باوجود بھی علی نے سر تک لحاف ڈالا اور ایک نظر سیدھا لیٹے، چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رضا پر ڈال کر اسکی جانب سے کروٹ بدل لی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، نئی جگہ پر نیند تو ویسے آنا مشکل ہی تھا، پر تھکن وجود پر الگ سوار تھی۔ وہ بھی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سر کا درد بڑھ گیا تھا۔

''میں تمہارے جتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں۔'' کمرے میں رضا کی آواز گونجی تو اُس نے پٹ سے آنکھیں کھولی۔

''کیا یہ اِس نے مجھے کہا ہے؟'' خود سے سوال کیا۔ پر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''جب مجھ میں اتنی اعلیٰ ظرفی آئی، تو میں بھی تم سے سب کے سامنے معافی مانگ لوں گا۔ فلحال! میں کم ظرف ہوں۔'' اُس نے تسلیم کیا تو اپنے لحاف کے اندر علی مسکرایا۔ رضا نے گردن موڑ کر اسکی جانب دیکھا۔ وہ اتنی جلدی سو نہیں سکتا تھا، پر جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے چہرہ واپس چھت کی جانب کر دیا۔

''وہ تو تم ہو۔'' علی کی آواز کمرے میں گونجی تو رضا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اب بھی اُسی کروٹ لیٹا تھا۔

''پر تمہیں معلوم ہے؟ احمد نے مجھے گلے لگایا۔ خود سے۔۔۔'' اِس بات پر رضا نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔ اب کہ علی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تو؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تو یہ کہ۔۔۔'' وہ رکا اور مسکرایا۔ ''تمہارا شکریہ! تم اتنے کم ظرف بھی نہیں ہو۔'' اُس نے کہا تو رضا چپ کا چپ رہ گیا۔

اِس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا، آسمان پر زوردار دھماکے کی صورت بادل گرجے اور اُسی لمحے بجلی چلی گئی۔

''شٹ!'' علی کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''ارے یار!'' اپنے کمرے میں مقدّم کا سامان ترتیب سے رکھنے میں اُسکی مدد کرتے عمر نے بیساختہ سر پر ہاتھ مارا تھا۔

بجلی ایک مرتبہ پھر کڑکی، راہداری کی آخر میں ایک اور محرابی کھڑکی تھی، بجلی کی کڑک سے پیدا ہوتی نیلی چمک، راہداری میں لگے پورٹریٹ پر پڑی تو حسین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بجلی کی چمک میں انسانی پورٹریٹ عجیب خوفناک قسم کے لگ رہے تھے۔

بادل ایک بار پھر گرجے اور اس بار اتنی زور سے کہ لگا کان کے پردے پھاڑ دیں گے۔ رضا نے دہل کے لحاف منہ تک تانا اور خود کو گم کر لیا۔ علی نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔ کیا وہ گرج چمک سے ڈرتا تھا؟

''نوید! ایس ایس پی نوید عالم۔۔۔ بات تو سنیں ایس ایس پی صاحب۔۔۔'' حسین دروازہ پر کھڑا اُسے آوازیں دے رہا تھا۔ یکدم ہی دروازہ کھلا۔

''میٹنگ ختم ہونے میں پندرہ منٹ ہیں۔انتظار کرو!''نوید نے منہ نکال کر کہا اور دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

''ارے! مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے باہر۔۔۔میں تو جم جاؤں گا۔''اُس نے دانت پر دانت جماتے ہوئے کہا۔دروازہ دوبارہ کھلا۔۔۔

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''اُس نے منہ نکال کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں! میری تو جوتی بھی نہیں ڈرتی کسی سے۔''حالانکہ ڈر لگ رہا تھا اُسے۔

''یہ لو پھر! اور باہر ہی رہو!''اُس نے پورے کا پورا لحاف حسین کو تھماتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

''تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔''دل ہی دل میں اُس سے بدلہ لینے کا مذموم ارادہ کر کے وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔سوچا تھا کہ رضا کے کمرے میں چلا جائیگا پر اُسکے کمرے کے درمیان چار کمروں کا فاصلہ تھا،اور وہ بھی اتنا کہ وہاں تک جانے میں ہی حسین کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہ لحاف کو اپنے گرد اچھے سے لپیٹ کر وہیں بیٹھ گیا۔

----------+---------+--------

بادل زور و شور سے گرج رہے تھے،اور علی کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔پر نیند نہیں آرہی تھی۔حلق الگ خشک ہوا پڑا تھا۔بجلی بھی اب تک بھی آئی تھی۔تنگ آکر وہ اٹھ بیٹھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا جگ اُٹھایا تو وہ خالی پڑا نظر آیا۔

''کیا مصیبت ہے یار؟''اُس نے کوفت سے خالی جگ کو دیکھا۔کمرے میں میز کے درمیان میں پرانے دور کا لینٹرن رکھا تھا۔جسے لائٹ جانے پر اُس نے جلا دیا تھا۔اب اُسکی پیلی روشنی میں وہ واقعی کوئی آسیب زدہ کمرہ لگ رہا تھا۔

''اب اسے کہاں سے بھروں؟''اُس نے بڑبڑاتے ہوئے برابر والے پلنگ پر محوِ خواب رضا کو عالمِ رشک میں دیکھا۔کتنے سکون سے سویا ہوا تھا وہ؟ پھر اچانک ہی اُسے یاد آیا کہ اُس نے ہال میں ڈسپنسر رکھا دیکھا تھا۔اکرم جاتے وقت اُس میں پانی کا کین لگا کر گیا تھا۔ہال کا سوچ کر ہی اُسے خوف آیا۔

''اب نیچے کیسے جاؤں؟''پریشان ہو کر سوچا۔دل میں خیال آیا کہ صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے ہیں،انتظار کر لینا چاہیے۔پر حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا، صبح تک تو وہ پیاس سے مر ہی جاتا۔بڑی ہمت کر کے وہ اُٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔راہداری گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

راہداری کے آخر میں بنی محرابی کھڑکی سے آتی آسمانی بجلی کی چمک یہاں تک ہلکی ہلکی پہنچ رہی تھی۔اس نے ماحول کو الگ ہیبت ناک بنایا ہوا تھا۔اُس نے گھبرا کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

''اب کیا کروں؟''ایک مرتبہ پھر پریشانی سے رضا کو دیکھا۔

''کیا اسے اٹھاؤں؟''دل میں سوچا۔پھر خیال آیا کہ اسے جگانے کے بعد کیا جواز دے گا؟اپنے ڈرنے کا بتا کر مذاق نہیں بنوا سکتا تھا۔لہٰذا خود ہی اپنے خیال کی تردید کی۔

''مرد بنو علی! تمہیں تو کم از کم ڈرنا نہیں چاہیے۔''خود کو شرم دلاتا وہ میز کے پاس آیا اور لینٹرن اُٹھالیا۔اُسکی جگہ اپنے موبائل کا ٹارچ آن کر کے اُسے وہیں رکھ دیا تاکہ اگر رضا نیند سے جاگے تو اندھیرا دیکھ کر پریشان نہ ہو جائے۔ پھر جی کڑا کر کے وہ لینٹرن اور جگ لیے باہر آیا۔لینٹرن کی روشنی میں راہداری میں قدم رکھا اور آگے بڑھنے لگا۔پیچھے آخری سرے پر لحاف لپیٹ کر بیٹھے حسین کی نظریں علی کے ہیولے پر پڑیں تو آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے دیکھا۔

''لگتا ہے کوئی ہے، کیا معلوم رضا ہو؟''اُس نے سوچا۔پھر لحاف کو اپنے سر سے پاؤں تک لپیٹ کر کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ اُسکے پیچھے جانے لگا۔دوسری جانب اندھیری راہداری میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا علی،اپنے پیچھے حسین کی آمد سے بے خبر تھا۔بالکنی سے پہلے جہاں راہداری کی دیوار شروع ہو رہی تھیں،وہاں غلطی سے اُسکے لینٹرن کی روشنی شلوار سوٹ اور قائدِ اعظم والی ٹوپی پہنے اُس آدمی کی پورٹریٹ پر پڑی تو دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ایسا لگ رہا تھا چچا اپنی خوفناک آنکھوں سے اُسے ہی گھور رہے ہیں۔

''واپس چلا جاؤں؟''بالکنی کی ریلنگ سے نیچے نظر آتے نیم اندھیرے ہال کو دیکھتے سوچا۔راہداری کی نسبت ہال میں زیادہ تعداد میں کھڑکیاں ہونے کے باعث وہاں کچھ کچھ روشنی تھی۔

''اب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو پانی بھی لے ہی لیتا ہوں۔''خود کو ہمت دلاتا وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آنے لگا۔ بارش اب ہلکی ہو چکی تھی۔ البتہ بجلی اب بھی ویسے ہی کڑک رہی تھی۔ وہ گول دائرے کی صورت اُترنے والی دائیں طرف کی سیڑھی سے اُتر رہا تھا، یکدم ہی اُسے لگا جیسے بائیں طرف والی سیڑھی پر بھی کوئی ہے۔ اُس نے فوراً لینٹرن کا رخ اُس جانب کیا پر اُسی لمحے تیز رفتار ہوا کے جھونکے سے لینٹرن بجھ گیا۔

''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔۔۔''اُس نے دہل کر جو دعائیں آتی تھیں پڑھنی شروع کر دیں۔ بائیں اور دائیں طرف والی سیڑھی کے درمیان پورا ہال موجود تھا۔ بجلی کی چمک میں ایک بار پھر پورا ہال روشن ہوا، پر اِس بار اُسے کوئی ہیولا نظر نہ آیا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ حقیقتاً کسی ہارر مووی کے اندر آ چکا ہے، بس! ابھی ہی کہیں سے کوئی مخلوق نکل کر آئیگی اور اُسے گدی سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے گی اور اندر سکون سے سوئے اُسکے دوستوں کو اُسکی وحشت ناک موت کی خبر بھی نہ ہو سکے گی۔

ڈسپنسر سامنے ہی تھا، اُس نے پلٹ کر اوپر بالکنی کی طرف دیکھا۔ اندھیری بالکنی دیکھ کر یقین نہیں آیا کہ ابھی ابھی وہیں سے آیا ہے، اور اب یہیں سے واپس بھی جانا ہے۔ اور اب تو لینٹرن بھی بجھ چکی تھی۔ واپسی کا سوچ کر ہی اُسے جھرجھری آئی۔

کیا تھا جو موبائل کا ٹارچ آن کر کے ساتھ لے آتا؟ کیا تھا جو رضا کو ہی اُٹھا دیتا؟ زیادہ سے زیادہ اُسکا مذاق ہی بنتا۔ بلکہ کیا ہی تھا اگر جو وہ صبح تک صبر سے کام لے لیتا؟ سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے اُس نے خود کو حقیقتاً کوسا تھا۔ پر پیاس خوف پر غالب آنے لگی تو وہ محرابی کھڑکیوں سے اندر آنے والی روشنی میں ہی اندازے سے ڈسپنسر کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ رہا تھا، بار بار ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی پیچھے کھڑا ہو، اور اُسکے پیچھے مڑتے ہی اُسکے دل میں خنجر پیوست کر کے اُسکا کام تمام کر دے۔ برا ہو اُن موویز کا جو اُس نے آج تک دیکھی تھیں۔ نہ دیکھی ہوتیں، تو پھر بھی اتنے خوفناک خیالات نہ آتے۔

''آ جاؤ اندر!''دوسری جانب میٹنگ ختم ہونے پر نوید نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا تھا۔ پر جواب ندارد۔۔۔

''حسین!''کوئی جواب نہ پا کر وہ راہداری میں آیا۔

''حسین کیا تم یہاں ہو؟''اُس نے ٹارچ آن کر کے یہاں وہاں دیکھا۔ پر راہداری خالی تھی۔ آگے علی کے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آ رہا تھا۔

''کیا یہ اُنکے کمرے میں ہے؟''اُس نے سوچا، پھر آگے بڑھا۔

''تم کتنے سست ہو مقدّم؟'' اُسکا آخری آخری سامان الماری میں رکھتے عمر نے تاسف سے کہا تھا۔

''میں بہت ایکٹو اور آرگنائزڈ انسان ہوں، بس یہ الماریاں سیٹ کرنا میرے بس کا کام نہیں ہے۔'' مقدّم نے بستر پر ڈھتے ہوئے کہا۔ وہ تو عمر اُسکی مدد کرنے آگیا تھا ورنہ اُس نے ساری رات اسی کام میں گزار دینا تھی۔

نیچے ہال میں آیت الکرسی کا ورد کرتے علی نے جگ میں پانی بھرا۔ لینٹرن وہ ہاتھ خالی کرنے کی غرض سے ڈسپنسر کے برابر میں رکھ چکا تھا۔ جگ بھر کر وہ پیچھے مڑا اور کسی سے بری طرح ٹکرایا۔ اسی لمحے بجلی زور سے کڑکی اور ہال گلابی روشنی میں نہا گیا۔ اِس پل بھر کی روشنی میں علی نے اُس سر تا پاؤں لحاف پہنے وجود کو اپنے قریب کھڑا دیکھا، اُسکے ہاتھ سے جگ چھوٹ کر نیچے گرا۔ اگلے ہی لمحے اُسکی، اور سامنے کھڑی مخلوق کی چھت پھاڑ چیخوں سے پوری حویلی گونج اٹھی تھی۔

آواز پر عمر اور مقدّم نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور اگلے ہی لمحے تیزی سے راہداری میں آئے، چیخوں کی آواز سن کر رضا کے دروازے پر رکتا نوید چونکنا ہوا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ آگے بڑھتے ہی عمر اور مقدّم سے سامنا ہوا۔ چیخیں تھیں کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' عمر نے نوید کو سامنے دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

''ہال سے آواز آرہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' وہ تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ دوسری طرف کی سیڑھیوں سے وہ دونوں بھی نیچے آئے۔ اندھیرے میں جو وجود نوید کو سیڑھیوں کے پاس ملا اُسے ہی، اُس نے کس کر بازوؤں میں جکڑا۔

''چھوڑو مجھے! بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔'' لحاف کے اندر سے وہ وجود دبی دبی آواز میں چیخا۔ پر نوید نے اُسکی آواز نہ سنی۔

''ہلنا مت ورنہ جان سے مار دوں گا۔'' نوید نے اُسے قابو کرتے سختی سے کہا۔

''ارے! کیوں مار دو گے بھائی؟'' وہ چیخا۔

''خاموش۔۔۔'' نوید نے اُسکی بولتی بند کروانے کے لیے بازو اُسکے گلے کے گرد لپیٹا۔

دوسری طرف علی الگ چلا رہا تھا۔اُسی لمحے قسمت کو رحم آیا اور بجلی واپس بحال ہوگئی۔ بجلی آنے کے بعد منظر کچھ یوں تھا کہ علی دل تھامے ڈسپنسر کے سامنے زمین بوس تھا، عمر اور مقدّم کچھ نا سمجھی کے عالم میں کھڑے تھے، جبکہ نوید کسی لحاف میں لپٹے وجود کو جکڑے ہوئے تھا۔

''علی! کیا ہوا؟'' عمر تیزی سے اُسکے پاس آیا۔

''جج۔۔۔ جن۔۔۔'' اُس نے لحاف لپیٹی خود کو نوید کے شکنجے سے آزاد کروانے کی کوشش کرتی، اُس مخلوق کی جانب اشارہ کیا۔

''چھوڑ بھی دو مجھے۔۔۔ انسان ہوں میں یار!'' حسین چیخا تو نوید کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ وہ آواز پہچان گیا۔

''حسین تم؟'' نوید نے اُسے چھوڑتے ہوئے اچھنبے سے کہا۔ اُس نے لحاف سر سے گرایا اور جھٹکے سے نوید سے دور ہونے کے چکر میں خود بھی زمین بوس ہو گیا۔

''تم؟ یہ تم تھے؟'' پہلے ہی دل پر ہاتھ رکھے فرش نشین علی نے اُسے دیکھ کر آنکھیں وا کرتے پوچھا۔

''ہاں! میں ہی ہوں، چیخنے سے پہلے پوچھ تو لیتے کہ کون ہے؟'' اُس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''تو تم لحاف پہن کر کیوں گھوم رہے ہو؟ اور وہ بھی میرے پیچھے؟'' علی نے بھی غصّے سے پوچھا، خوف کا اثر کم ہوا تو صورتحال اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگی۔ مقدّم نے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ نوید نے تاسف سے دونوں کو دیکھا، جبکہ عمر نے ہاتھ کا سہارا دے کر علی کو اٹھایا۔

''تم نیچے کرنے کیا آئے تھے؟'' عمر نے اُس سے پوچھا۔

''پانی لینے آیا تھا۔ پیاس لگ رہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ میرے پیچھے گھوم رہا ہے اور وہ بھی اِس حلیے میں۔۔۔'' اُس نے چڑ کر کہا۔

''میں تمہارے پیچھے نہیں گھوم رہا تھا۔ میں نے فقط ایک عجیب سی مخلوق کو لینٹرن لیکر گھر میں گھومتے دیکھا تو سوچا جا کر دیکھ لوں۔ مجھے کیا معلوم کہ تم ہو۔'' وہ بھی نوید کا سہارا لیکر کھڑا ہوا۔ لحاف اُس نے البتہ ابھی بھی نہیں اتارا تھا۔

''لینٹرن لیکر؟ کہاں ہے لینٹرن؟'' مقدّم نے حیرت سے پوچھا۔ اب عمر بھی اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔

''وہ ہوا سے بجھ گیا۔'' علی نے ذرا شرمندگی سے کہا۔ خوف ختم ہوا تو اپنی بزدلی پر شرم سے ڈوب مرنے کو دل چاہا۔

''تم اِس حلیے میں گھوم کیوں رہے ہو؟'' اُس نے شرمندگی چھپانے کے لیے ایک مرتبہ پھر حسین پر چڑھائی کی۔

''ٹھنڈ لگ رہی تھی، اور کیا کرتا؟'' اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''ٹھنڈ لگ رہی تھی تو یہ پہن کر گھومنے کا کونسا طریقہ ہے؟'' علی نے گھورا۔

''تمہارے جگری یار نے کمرے سے دیا نکال دیا تھا، اور ساتھ میں لحاف پکڑا دیا ٹھنڈ سے لڑنے کے لیے۔'' اِس بات پر تینوں نے حیرت سے نوید کو دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں خجل ہوا۔

''چلو تم! اِس لیے تمہیں میں نے اپنی نظروں کے سامنے رکھا ہوا ہے۔'' اِس سے پہلے کہ کوئی بھی نوید سے سوال کرتا، وہ حسین کو کھینچتا کھانچتا اپنے ساتھ اوپر لے گیا۔ پیچھے کھڑے علی نے اُن دونوں کا منہ دیکھا، جنکے چہرے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہے تھے۔

''ڈرتا نہیں ہوں میں، بس۔۔۔ وہ۔۔۔ صورتحال ہی ایسی ہو گئی تھی۔'' اُس نے وضاحت دی۔ پر اگلے ہی لمحے اُن دونوں کو قہقہ لگا کر ہنستا دیکھ، اُس نے غصّے سے جگ اٹھایا اور اوپر کی طرف بڑھ گیا۔

''پانی تو لے جاتے۔۔۔'' عمر نے کہا۔

''نہیں پینا اب۔۔۔'' اُس نے بنا مڑے ہی تنک کر جواب دیا تو اب کہ مقدّم ہنستے ہنستے رکوع میں چلا گیا۔

''لینٹرن بھی یہیں رہ گیا ہے۔'' اِس بار اُس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ راہداری میں گم ہو گیا۔ پیچھے مقدّم اور عمر کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دوسری جانب اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر علی بھی بیساختہ مسکرا دیا۔

----------+---------+--------

''تم اب ہلے نہ یہاں سے۔۔۔ پھر دیکھنا۔'' نوید نے حسین کو کمرے میں لا کر چھوڑتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں نہیں ہلا تھا یہاں سے، تم ہی تھے جس نے اس قدر ٹھنڈ اور اندھیرے میں مجھے کمرے سے باہر نکال دیا۔'' اُس نے اپنا ریم لیس چشمہ اُتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے خفگی سے کہا تو نوید نے کوئی جواب نہ دیا۔

''عجیب غنڈہ گردی مچائی ہوئی ہے تم نے ،اب تم نکال کر دکھاؤ مجھے کمرے سے!''وہ بھی اُس کو دھمکاتا لحاف لپیٹ کر سونے لیٹ گیا۔نوید نے تاسف سے اُسے دیکھا پھر میز پر رکھی اپنی کھانے کی پلیٹ اٹھالی، جسے وہ میٹنگ کی وجہ سے کھا نہیں سکا تھا۔

''کیا تم نے اگا تھا کرسٹی کا ناول پڑھا ہے؟''ابھی اُس نے پہلا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ حسین نے یکدم ہی چہرے سے لحاف ہٹا کر اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اگا تھا کرسٹی نے سینکڑوں ناول لکھے ہیں۔''نوید نے سنجیدگی سے جتایا۔

“AND THEN THERE WERE NONE “

(اور پھر وہاں کوئی نہ رہا)

حسین نے ناول کا نام بتایا، تو نوید نے کھانا روک کر سر تا پاؤں اُسے گھورا۔

''نہیں! اور میں اُسکے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔''اُس نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''آں۔۔۔''اُس نے مسکراتے ہوئے ایسے سر ہلایا جیسے کچھ سمجھ میں آیا ہو۔''تم نے پڑھ رکھا ہے۔پر تم بتانا نہیں چاہتے۔''وہ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجائے اُسے دیکھنے لگا۔

''حسین!''نوید نے اُسے تنبیہہ کرتے انداز میں کہا۔

''اوکے! میں سو رہا ہوں۔''اُس نے دوبارہ لحاف تان لیا تو نوید نے سکھ کا سانس خارج کیا۔

دوسری طرف اپنے کمرے میں واپس آ کر جگ میں موجود تھوڑے سے پانی کو پیتے علی نے ایک بار پھر رشک سے رضا کو دیکھا تھا۔اتنے شور شرابے کے باوجود بھی، وہ ایک انچ نہیں ہلا تھا۔کاش! ایسی نیند اُسکی بھی ہوتی۔کچھ سر کے درد کی وجہ سے بھی وہ نہیں سو پا رہا تھا۔

پانی زیادہ نہیں تھا، فقط پیندے میں موجود تھا۔اتنے کم پانی سے اُسکی تسلی ضرور ہوگئی پر پیاس نہ بجھی۔اچھا بھلا عمر کہہ بھی رہا تھا کہ پانی لے جاؤ، اب دوبارہ تو وہ مر کر نہیں جانے والا تھا۔بے شک بجلی بحال ہوگئی ہو۔ خالی جگ رکھ کر وہ اپنے پلنگ کی طرف بڑھنے لگا۔

''امم۔۔۔امی۔۔۔''اس آواز پر اُس کے قدم تھمے۔اُس نے پلٹ کر دیکھا تو رضا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''رضا!''اُس نے بھنویں اچکا کرنا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے امی!''وہ پھر بڑبڑایا۔اُسکی بڑبڑاہٹ نیم واضح سی تھی۔

''کس سے ڈر لگتا ہے؟''علی نے اُسکے قریب آکر پوچھا۔

''امی۔۔۔کہاں ہیں؟''وہ پھر بولا،غالباًوہ نیند میں بڑبڑارہا تھا۔

''رضا!تم ٹھیک ہو؟''علی نے اسے کندھے سے ہلایا تو نیند میں بھی اُسکے چہرے پر کرب ناک قسم کے تاثرات آئے۔

''امی کے پاس جانا۔۔۔''وہ کہتے ہوئے کسمسا کر کروٹ بدل گیا۔وہ وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا،اب وہ نہیں بڑبڑارہا تھا۔اُسے کچھ دکھ،کچھ افسوس سے دیکھتے،علی کی نظریں دونوں بستروں کے درمیان رکھی سائیڈ ٹیبل پر گئیں۔جہاں سے کچھ دیر پہلے رضا نے کتابیں ہٹائی تھیں۔وہاں اب کافی ساری دواؤں کے ڈبّے رکھے تھے۔اُس نے حیرت سے دیکھتے ایک دوا کا ڈبہ اٹھا کر دیکھا،فارمولا پڑھ کر اُسے کچھ خاص سمجھ نہ آیا کہ دوا کس مرض کی ہے؟

اُس نے ایک نظر گہری نیند سوئے رضا کو دیکھا۔پھر دوا کا ڈبہ کھول کر اندر سے کمپنی کی جانب سے فراہم کردہ معلوماتی پرچہ باہر نکالا اور پڑھنے لگا۔پہلے اُس نے ایک دوا کے متعلق پڑھا،پھر دوسری،پھر تیسری اور ایسے کر کے اس نے تمام دواؤں کے متعلق پڑھ ڈالا۔جیسے جیسے وہ پڑھتا جارہا تھا،اُسکے چہرے پر سایہ سا گزر رہا تھا۔

وہ سب اینٹی اینزائٹی،اینٹی ڈپریسنٹ،نیند کی دوا،اور کچھ کم ڈوز کی سکون آور ادویات تھیں۔ایک دوا مائیگرین کے لیے بھی تھی۔اُس نے خاموشی سے تمام دوائیں واپس رکھ دیں اور چپ چاپ سا اپنے پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔اُسکی خاموش نظریں رضا پر ہی تھیں،جو اُسکی جانب پیٹھ کر کے سویا ہوا تھا۔

یونیورسٹی کے زمانے کا رضا اس لمحے اُسے شدت سے یاد آیا تھا۔اپنا وہ ذہین اور کلاس ٹاپر دوست یاد آیا۔وہ حالات سے ستایا خاموش طبع لڑکا یاد آیا۔کیا حال کر لیا تھا اس لڑکے نے اپنا؟یا یہ کہنا چاہیے کہ کیا حال کر دیا تھا قسمت نے،زمانے نے اور رشتوں نے اُسکا۔چاہتا ہی کیا تھا وہ بھلا؟فقط محبت۔۔۔توجہ۔۔۔جو اُسکا حق تھیں۔ اور کیا دیا اُسے دنیا نے بدلے میں؟دھتکار۔۔۔ذلت۔۔۔بلا وجہ کی نفرت۔ کیا یہ ذہین

وہ دنیا تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھنے والا لڑکا، ان سب کا مستحق تھا؟ اُس نے افسوس سے اُسکی آدھ کھائی پلیٹ کو دیکھا۔ علی نے ظاہر نہیں کیا تھا، پر وہ جانتا تھا کہ اُس کے اُس ایک جملے کے بعد ہی رضا نے کھانا خاموشی سے رکھ دیا تھا۔ خود پر افسوس ہوا۔ اُسی لمحے کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ چونکا۔

پھر حیران سا اُٹھ کر دروازے پر آیا اور اُسے کھولا۔ سامنے عمر ہاتھوں میں پانی کی بوتل لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"تمہیں پیاس لگی تھی۔" اُس نے بوتل اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا شکریہ! پر یہ کہاں سے ملی؟" علی کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"کچن سے، اور کچن ڈھونڈنے میں مجھے اور مقدّم کو آٹھ منٹ لگ گئے۔ اس لیے دیر ہوگئی ورنہ پہلے لے آتا۔" اُس نے بتایا۔

"سوری! میری وجہ سے اتنی پریشانی ہوئی تمہیں۔ میں جگ نیچے چھوڑ آتا تو اُسے ہی بھر لیتے۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں! ایسی بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی بہانے تھوڑی سی حویلی دیکھ لی۔" اُس نے بھی مسکرا کر کہا۔

"چلو اب تم سو جاؤ۔" عمر نے کہا۔

"تمہارا ایک بار پھر شکریہ!" علی نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ علی اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

اسکے دوست واپس لوٹ رہے تھے۔۔۔

وہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آکر لیٹ گیا۔ سر کا درد کم ضرور ہوا تھا، پر ختم نہیں ہوا تھا۔ ساری رات کروٹ بدلتے بدلتے بالآخر فجر سے کچھ دیر قبل ہی اُسے نیند آئی تھی۔

دروازے پر ہونے والی زوردار دستک سے اُسکی آنکھ کھلی تو لحاف چہرے سے ہٹا کر آنکھیں ملتے ناسمجھی سے آس پاس دیکھا۔ جیسے سمجھ نہ آیا ہو کہ آواز کہاں سے آئی ہے؟ رضا نے بھی نیم وا آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھا تھا۔

"دروازے پر کوئی ہے شاید!" رضا نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہتے کروٹ بدلی اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

''تو؟'' علی نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''تو جا کر دیکھو کون ہے؟'' اُس نے آنکھیں موندے ہی جواب دیا تو اُس کو آگ ہی لگ گئی۔

''میں نوکر ہوں تمہارا؟'' اُس نے تڑخ کر پوچھا۔اِس سے پہلے کہ رضا کوئی جواب دیتا دروازہ ایک مرتبہ پھر پیٹا گیا۔ علی نے پلٹ کر پہلے دروازے کو، پھر ایک مرتبہ دوبارہ رضا کو دیکھا، جس نے لحاف میں چہرہ چھپاتے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی۔ وہ اُسے گھورتا ہوا اُٹھ بیٹھا، پھر لحاف پرے کرتا کھڑا ہوا اور دروازے پر آیا۔ یہاں تک آتے آتے ہی اُسکے دانت بج گئے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تو سامنے نوید کو کھڑا پایا۔

''کیا ہوا؟ سب خیریت؟'' اُسے سامنے دیکھ کر وہ پریشان ہوا۔

''صبح ہو چکی ہے، نیچے ناشتہ لگ چکا ہے۔ جلدی آؤ!'' اُس نے کہا تو مارے حیرت کے اُسکا منہ کھلا۔

''ابھی؟'' اُس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''ناشتہ صبح ہی کیا جاتا ہے؟'' نوید نے جتایا۔

''پر ابھی تو صرف سات بجے ہیں؟'' اُس نے پیچھے دیوار پر لگے گھڑیال کو دیکھتے کہا۔

''صبح فجر کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔'' ایک مرتبہ پھر جتایا گیا۔

''میں فجر سے پون گھنٹہ قبل ہی سویا تھا، اس لیے نماز قضا ہو گئی۔'' اُس نے شرمندہ ہوتے وضاحت دی۔

''خیر! ناشتہ تیار ہے، حسین نیچے ہی ہے، تم بھی آجاؤ۔ اور اسکو بھی اُٹھاؤ!'' وہ رضا کی طرف اشارہ کر کے حکمیہ انداز میں کہتا آگے بڑھ گیا۔ علی نے صبر کے گھونٹ بھر کر اُسے جاتے دیکھا، پھر پیچھے سوئے ہوئے رضا کو۔ پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آیا۔

''آرڈر تو سن ہی لیا ہو گا تم نے، اب خود ہی اُٹھ جاؤ!'' وہ تپے ہوئے لہجے میں کہتا، دراز میں سے اپنا برش نکالنے لگا۔ رضا نے کوئی جواب نہ دیا پر بیزار منہ بنا کر اُٹھ بیٹھا۔

کچھ دیر بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر، بال تمیز سے سیٹ کیے، راہداری کے اختتام پر بنی بالکنی میں پہنچا تو نیچے ہال میں عمر، مقدّم اور حسین کو پہلے سے ہی موجود پایا، ساتھ اکرم بھی تھا۔ عمر ہال کی محرابی قد آدم کھڑکیوں سے باہر کا خوابناک منظر ملاحظہ کر رہا تھا۔ مقدّم اور حسین ہال کے صوفے پر بیٹھے آپس میں محو گفتگو تھے۔

''السلام علیکم!'' علی کو سیڑھیاں اُتر کر آتا دیکھ اکرم نے سلام کیا، وہ سر کے اشارے سے جواب دیتا نیچے آیا۔ اُسے سامنے دیکھ کر مقدّم کو رات والا واقع یاد آیا تو مسکراہٹ نے پھر اُسکے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ علی اُسے نظرانداز کرتا ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سیڑھیوں کی ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''رضا کہاں ہے؟'' حسین نے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''میں جب کمرے سے نکل رہا تھا تو وہ برش کر رہا تھا۔ باقی مجھے نہیں معلوم!'' اُس نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''جان سے تو نہیں مار دیا اُسے رات کو؟'' اِس سوال کے جواب میں علی نے فقط اُسے سنجیدگی سے گھورا ہی تھا۔

''مجھے اتنی صبح صبح اُٹھنا سخت زہر لگ رہا ہے۔'' مقدّم نے اچانک ہی اعلان کیا۔

''صبح اٹھنا صحت کے لیے اچھا ہے، اور تم ذرا باہر دیکھو! کتنا پیارا منظر ہے۔'' عمر نے پاس آتے ہوئے کہا۔

''میں بچپن سے یہی منظر دیکھتے بڑا ہوا ہوں۔'' اُس نے جمائی لیتے صوفے کے ہاتھ پر سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''نوید نظر نہیں آ رہا؟'' علی نے آس پاس دیکھتے کہا۔

''ہمیں اسکے حوالے کر کے خود نجانے کہاں گیا ہے؟'' مقدّم نے اکرم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''رات کو اتنی چیخ و پکار مچ گئی، پر رضا کی نیند میں کوئی فرق نہیں پڑا۔'' عمر کو اچانک ہی یاد آیا تھا۔

''اُس نے نیند میں راشد ڈرائیور کو بھی مات دے دی ہے۔'' مقدّم نے تبصرہ کیا۔

''مجھے تو اب مکمل یقین ہو گیا ہے کہ یہ رات کو ہی رضا کا قصّہ تمام کر چکا ہے۔ اگا تھا کرسٹی کے ناول کی طرح!'' حسین کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی۔

''نہیں! میں نہیں مانتا کہ علی ایسا کر سکتا ہے۔'' مقدّم نے یکدم ہی کہا۔

''وہ کیوں؟'' حسین نے ذرا اچھنبے سے پوچھا۔ (صاف اداکاری!)۔ علی سنجیدگی سے دونوں کو گھور رہا تھا۔

''اِسکے پاس اتنا دماغ نہیں ہے۔'' مقدّم نے واضح سرگوشی کی تو حسین اُسکے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا تھا۔ بہت عرصے بعد۔۔۔ دوستوں کی طرح۔۔۔ اگر یہ دو لوگ نہ ہوتے تو شاید دوستی پھر سے تازہ ہونے میں صدیاں لگ جاتیں۔ علی نے بھی برا نہیں مانا۔ نجانے کیوں؟ پر وہ بھول بیٹھا کہ ان سب سے تعلقات پہلے جیسے نہ رہے تھے۔ یا شاید اس نے جان کر بھلا دیا۔

''رضا کچھ دوائیں لیکر سویا تھا۔ اِس وجہ سے شاید وہ اتنی گہری نیند سویا ہوا تھا۔'' علی نے آہستگی سے کہا تو تینوں نے اُسے دیکھا۔

''دوائیں؟ کیسی دوائیں؟'' اب کہ مقدّم نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سکون آور ادویات تھیں شاید! ساتھ کچھ اور بھی تھیں۔'' اُس نے بتایا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟'' عمر حیران ہوا۔

''میں نے اُسکی دوائیں دیکھنے کی کوشش کی تھی، اتنا ہی سمجھ سکا کہ۔۔۔''

''ضروری نہیں وہ دوائیں ہی ہوں۔'' رضا اُسکی بات کاٹتے سیڑھیاں اُترتے نیچے آیا۔ چہرہ تر و تازہ تھا۔ علی ہڑبڑا کر ریلنگ سے دور ہٹا۔

''پھر کیا تھیں؟'' حسین نے مشکوک انداز میں اُسے دیکھا۔

''برانڈڈ ڈرگس بھی ہو سکتی ہیں۔'' وہ مزے سے جواب دیتا، اُسکے برابر آبیٹھا۔ جہاں علی نے اس جواب پر دانت کچکچائے تھے، وہیں باقی تینوں بیساختہ مسکرائے تھے۔

''آپ لوگ باورچی خانے میں آجائیں۔'' اکرم نے ایسے کہا جیسے اُسے رضا کے آنے کا ہی انتظار ہو۔

''باورچی خانے میں؟ کیا ناشتہ بھی ہم سے بنوانا ہے؟'' رضا نے حیرت سے پوچھا۔

''بھی سے کیا مراد؟ تم نے اور کونسا تیر مارا ہے؟'' مقدّم نے اُس سے زیادہ حیرت سے پوچھا۔

''سامان خود اُٹھا کر لایا ہوں، کمرہ خود سیٹ کیا ہے۔ اتنا کافی نہیں ہے؟'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''کتنا احسان کیا تم نے ہماری ذات پر؟'' حسین طنزیہ انداز میں کہتا آگے بڑھا۔

''ویسے سوال میرا ابھی یہی ہے کہ کچن میں ہمارا کام کیا ہے؟'' علی نے اکرم کو دیکھتے پوچھا، جو اُن سے آگے آگے چل رہا تھا۔ ہال کی دائیں جانب والی سیڑھیوں کے برابر میں ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا، دروازے کے اندر ایک طویل راہ داری نظر آ رہی تھی۔

''فکر نہ کرو ناشتہ نہیں بنوانا تم سے، ڈائننگ ہال کچن سے منسلک ہے، اس لیے وہیں بلوا رہا ہے۔'' اکرم کے بجائے عمر نے جواب دیا تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' رضا حیران ہوا۔

''رات کو میں اور عمر آئے تھے کچن ڈھونڈتے ہوئے، تو دیکھ کر گئے تھے۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''لیکن تم دونوں رات کو کچن ڈھونڈ کیوں رہے تھے؟'' رضا نے مشکوک ہوتے پوچھا۔

''ارے ہاں! تمہیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ رات کو کیا ہوا تھا؟ نشہ کر کے جو سوئے تھے۔'' حسین نے مزے سے کہا تو رضا نے اُسے گھورا جبکہ علی کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی تھی۔ اب مقدّم اور حسین مل کر اُسے رات والا واقعی سنا رہے تھے۔ علی اُنکی بکواس سے بچنے کے لیے راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ اس گھر کی باقی جگہوں کی طرح راہ داری دیکھ کر بھی اُسکا منہ کھلا ہی تھا۔

راہداری لمبی، کشادہ اور دور تک سیدھی پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر چمکتے ہوئے لکڑی کے تختے نہایت صفائی اور ترتیب سے جڑے ہوئے تھے، جن کے بیچوں بیچ ایک لمبا قالین بچھا ہوا تھا۔ راہ داری کی ایک پوری دیوار بلند و بالا شیشے کی کھڑکیوں پر مشتمل تھی۔ یہ کھڑکیاں فرش سے تقریباً چھت تک پھیلی ہوئی تھیں، ان کھڑکیوں سے باہر وسیع پیمانے پر پھیلے سرسبز باغ اور پیچھے موجود بلند و بالا پہاڑوں کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اتنا خوبصورت منظر کہ راہداری میں کھڑے ہو کر ہی پورا دن گزار دیا جائے۔ ان شفاف شیشوں سے چھن کر آتی صبح کی نرم گرم دھوپ لکڑی کے فرش پر سنہری دھاریوں کی صورت بکھر رہی تھی۔ ہر کھڑکیوں کے درمیان میں نفیس لکڑی کی میزیں رکھی ہوئی تھیں، جن پر سفید پھولوں سے بھرے گلدان سجے تھے۔ ان گلدانوں کے قریب سنگِ مرمر سے تراشے گئے انسانی مجسمے ایستادہ تھے۔ ان مجسموں

کے چہروں پر ایک عجیب سی خاموش وسنجیدگی تھی، علی رک کر مجسموں کا جائزہ لینے لگا،اُسکے پیچھے آتے عمر کا بھی یہی حال تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے بنانے والے کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

''تم لوگوں نے اگاتھا کرسٹی کا ناول پڑھا ہے؟'' پیچھے آتے حسین کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''کونسا؟'' رضا نے پوچھا۔

''اینڈ دین دیئر ور نن!''

''بچپن میں کبھی پڑھا تھا،اب کہانی بھول گئی ہے۔ میں نے اگاتھا کرسٹی کے بہت سے ناول پڑھے ہیں، ذرا یاد دلانا یہ کونسا والا ہے؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''جس میں ایک پُراسرار قاتل دس لوگوں کو ایک جزیرے پر جمع کرتا ہے، اور باری باری سب کا قتل کرتا ہے، کچھ اِس طرح کے کوئی بھی نہ قاتل کو ڈھونڈ پاتا ہے اور نہ قتل کے وقت موجود ہوتا ہے۔ اور قاتل انہی میں سے ایک ہوتا ہے۔'' حسین نے کہانی کا خلاصہ پیش کیا۔

''اوہ! وہی والا جس کے آخر میں جج ور گریو قاتل نکلتا ہے؟'' مقدّم کو یکدم ہی یاد آیا، اور اِس سے پہلے کہ حسین مزید کچھ کہتا ایک زوردار قسم کا تھپڑ مقدّم کو اُسی لمحے اپنے سر پر پڑا تھا۔

''آہ۔۔۔'' وہ چیخا اور پلٹ کر رضا کو دیکھا، جس نے ابھی ابھی یہ کارروائی کی تھی اور اب اُسے دانت پیستے گھور رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' وہ سر سہلاتے چیخا تو راہداری میں اُسکی آواز گونجی۔

''میں نے وہ ناول آدھا پڑھا تھا، رات کو مکمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن تمہیں اپنی زبان چلانا ضروری تھا؟'' رضا نے خفگی سے کہا۔

''مجھے کیا پتہ تم وہ پڑھ رہے تھے؟'' اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ عمر نے کچھ حیرت سے اُن تینوں کو دیکھا تھا۔ چلو مقدّم اور حسین تو آپس میں جلدی گھل مل گئے تھے، پر رضا؟ کبھی یونیورسٹی کے زمانے میں بھی اُن تینوں کا یہی حال ہوا کرتا تھا۔ وہ کچھ حیران، کچھ خوشگوار سا یہ منظر دیکھتے واپس راہداری میں محو ہوا۔

''اب تو اسپوئیل ہو ہی گیا ہے، تو یہ بھی سن لو کہ اُس نے یہ کیا کیسے؟'' حسین نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ رضا کو دیکھا۔

''خبردار! ایک لفظ بھی نہ بولنا۔''اس نے اُنگلی اُٹھا کر اُسے تنبیہہ کی تو حسین اور مقدّم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

''اتنا بھی اسپوئیل نہیں ہوا ابھی۔ میرے مطابق توجج ور گریو وہ چھٹا بندہ تھا، جو اُس قاتل کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے، پر اُس نے یہ کیسے کیا؟ اور باقی سب کو کیسے مارا۔ یہ میں تمہارے منہ سے ہرگز نہیں سننا چاہتا۔''اُس نے حتمی لہجے میں کہا۔

راہداری کی چھت باقی گھر کی چھت کی طرح ہی بلند اور نہایت نفیس آرائش سے مزین تھی۔ چھت سے لٹکتے شاندار فانوس قطار در قطار آویزاں تھے، جن کے شفاف کرسٹل کے ٹکڑوں سے جب دھوپ ٹکراتی تو چھوٹے چھوٹے عکس دیواروں اور فرش پر بکھر جاتے۔ علی تو راہداری کے حسن میں کھو سا گیا تھا، پاس کھڑا عمر بھی مسحور سا ہر شے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ایک تو یہ دونوں آرٹسٹ!''حسین نے دونوں کو ارد گرد محو دیکھ کر کہا تھا۔ اکرم راہداری پار کر کے کب کا جا چکا تھا۔ جبکہ وہ لوگ وہیں ٹکے ہوئے تھے۔

''کم از کم اِن کے پاس کرنے کو کوئی کام تو ہے، ہم تو یہاں سارا دن فارغ بیٹھنے والے ہیں۔''مقدّم نے کہا۔

''کوئی نہیں! میں تو باہر گھومنے پھرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''حسین نے کہا۔

''اُس سے پہلے ایک بار نوید سے ضرور نمٹ لینا۔''مقدّم نے جتایا۔

''کیوں؟ وہ میرا باپ ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''تم دونوں یہ سوال ایک مرتبہ نوید سے ہی کیوں نہیں کر لیتے؟''رضا نے چڑ کر کہا تھا۔

''یہاں آجائیں پلیز! ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''اُسکے کچھ بھی کہنے سے قبل ہی اکرم نے راہداری کے آخری سرے سے جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

''چلو! ناشتہ کرتے ہیں۔''علی کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

راہداری کے اختتام پر ڈائننگ ہال کا دروازہ تھا، اندر پورا ہال موجود تھا، وہی ایک جانب قد آدم شیشے کی دیوار، جس سے باغ کا منظر واضح تھا۔ لکڑی سے بنا انٹیریر اور درمیان میں قریب چوبیس کرسیوں والا ڈائننگ ٹیبل۔ شیشے کی دیوار سے چھن کر آتی صبح کی دھوپ میز پر

رکھے ناشتے کے برتنوں پر پڑ رہی تھیں۔ڈائننگ ہال کے اندر، بائیں جانب ایک اور دروازہ تھا جو باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ باورچی خانہ بھی باقی گھر جیسا ہی تھا، وسیع اور کشادہ، لکڑی کے خوبصورت نقش و نگار والا۔

وہ لوگ باری باری کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھنے لگے۔نوید سربراہی کرسی پر، سیاہ ٹراؤزر پر سیاہ گول گلے والی شرٹ پہنے،اور اُس پر سیاہ رنگ کا ہی جیکٹ ڈالے بیٹھا تھا۔جیکٹ سامنے سے کھول رکھی تھی،ایک ہاتھ کی مٹھی بنا کر اُسے ران پر رکھے،دوسری کہنی کو میز پر رکھ کر ہاتھوں کی مٹھی ہونٹوں پر ٹکائے،وہ سنجیدگی سے اُن سب کو دیکھ رہا تھا۔

جب سب بیٹھ گئے تو اکرم نے پیالیوں میں چائے نکالنی شروع کر دی۔تازہ سینکی ہوئی ڈبل روٹی، ساتھ آملیٹ اور مکھن و جیم وغیرہ رکھے تھے۔کچھ پھل بھی کٹے ہوئے تھے۔اتنا زیادہ کچھ نہ تھا، لیکن جو بھی تھا پورے اہتمام کے ساتھ تھا۔اُن لوگوں نے ناشتہ شروع کیا تو بھی نوید عالم اسی پوزیشن میں بیٹھا اُنہیں دیکھتا رہا۔وہ اور بات ہے کہ کسی نے بھی اُسکی طرف دھیان نہ دیا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں۔۔۔''ناشتے کے دوران مقدّم کو یاد آیا تو حسین سے پوچھا۔

''کیا؟''وہ ذرا حیران ہوا۔

''یہی کہ تمہیں اگاتھا کرسٹی کا ناول کیوں یاد آیا؟''اِس بات پر ہونٹوں پر مُٹھی جمائے بیٹھے نوید نے بھنویں سکیڑ کر حسین کو دیکھا۔

''تھوڑے تھوڑے حالات ہمارے بھی ویسے ہی بن رہے ہیں۔''اُس نے دانت نکالے۔

''تمہارے میں منہ میں خاک،اِس حساب سے تو ہم سب مارے جائیں گے۔''مقدّم نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''اور مارنے والا ہم ہی میں سے کوئی ہوگا۔''رضا نے بات مکمل کی۔

''میں تو شریف آدمی ہوں، تمہارے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''حسین نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''بات سنو! میں عادی نشئی ضرور ہوں۔پر عادی قاتل نہیں ہوں۔''رضا نے برا مناتے ہوئے کہا تو ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے علی نے سنجیدہ نظروں سے اُسے گھورا تھا، جسے برابر نظرانداز کیا گیا تھا۔

''عادی نشئی ہونا کافی ہے۔''حسین نے آہستہ آواز میں سرگوشی کی۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' وہ چبا چبا کر کہتا واپس چائے کی جانب متوجہ ہوا۔

''ناشتے کے لیے تمہارا شکریہ اکرم!'' عمر نے آملیٹ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اکرم کا شکریہ ادا کیا تو اُس نے کچھ عجیب سے انداز میں مسکرا کر پہلے نوید کو دیکھا، پھر دوبارہ اُسکو۔

''شکریہ کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔ پر یہ ناشتہ میں نے نہیں بنایا ہے۔'' اِس بات پر سب نے ہی رک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تو پھر کس نے بنایا؟'' علی نے پوچھا۔

''وہ۔۔۔۔نوید بھائی نے۔'' اُس نے نوید کی جانب اشارہ کیا تو سب کی گردنیں ایک ساتھ سربراہی کرسی کی جانب مڑی تھیں۔ جبکہ نوید نے ہونٹوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے گہری سانس لی اور خالی پلیٹ اپنی جانب کھسکائی۔ اب سب اُسکی جانب متوجہ تھے اور وہ ناشتے کی جانب۔

''یہ مہربانی کس لیے؟'' حسین نے تھوڑا مشکوک ہوتے پوچھا۔ آیا وہ ہی جج ور گریو کی طرح قاتل نکلے اور اُنہیں ناشتے میں زہر ملا کر دے دے۔

''اکرم کا کام صفائی کرنا اور کپڑے وغیرہ دھو کر استری کرنا ہے۔ کھانا بنانا نہ اسے آتا ہے اور نہ یہ اِسکی ذمّے داری ہے۔ کل اِسکی والدہ نے مہمان نوازی کے طور پر رات کا کھانا بھیج دیا تھا، پر روزانہ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' ڈبل روٹی کے آدھے حصّے پر مکھن لگاتے نوید نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ اِس گفتگو کا مقصد اُنہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''تو؟'' علی نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تو یہ کہ آج میں نے ناشتہ بنا دیا ہے۔ کل سے ناشتے اور کھانے کے لیے باریاں لگے گی۔'' اس بات پر سب کا منہ کھلا تھا۔ آدھے حصے پر مکھن لگانے کے بعد بقیہ آدھے پر جیم لگاتا نوید بے حد سنجیدہ تھا۔

''اِس بات کا مطلب؟'' مقدّم نے سنبھل کر پوچھا۔

''آسان زبان میں بات کی ہے میں نے۔'' اُس نے بھنویں اُچکا کر مقدّم کو دیکھا، چہرہ نہیں اٹھایا، بس آنکھیں اٹھائی تھیں۔

''مہینہ ڈیڑھ مہینہ یہاں رہنا ہے تو کام برابری سے کرنا ہوگا۔ راشن ہمارے پاس محدود ہے، ختم ہونے کی صورت میں اکرم کو شہر جانا پڑتا ہے اور شہر جانے کے لیے سڑک، موسم اور دیگر عوامل کو بھی مد نظر رکھنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص اپنے لیے الگ الگ کھانا، ناشتہ تیار نہیں کر سکتا۔ ایک ہی بندے کو سب کے لیے ناشتہ اور کھانا بنانا ہوگا۔ اِس لیے سب باری باری یہ کام کریں گے۔'' یہ نیا انکشاف تھا۔ اسکے بعد تو حلق سے نوالہ اُترنا دوبھر ہو گیا تھا۔ جبکہ خود وہ سکون سے اپنا ناشتہ کرتے تمام تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ اُنکی مرضی اور دلچسپی کے بغیر!

''یعنی! چھے بندوں کا کھانا اور ناشتہ بنانا ہوگا؟'' حسین نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا تھا۔

''ہاں! آج میں ناشتہ بنا چکا ہوں، لہٰذا تم لوگ فیصلہ کر لو کہ کھانا کس نے بنانا ہے؟'' چائے کا کپ لبوں سے لگاتے نوید عالم نے شاید آج پہلی بار اتنی لمبی گفتگو کی تھی۔

''ناشتہ صبح سات بجے کرنا ضروری ہے؟'' علی نے سنبھل کر پوچھا۔

''ہاں! کیونکہ یہاں گیس صبح چھے بجے آتی ہے اور گیارہ بجے چلی جاتی ہے۔ ناشتے اور کھانے کا انتظام گیس جانے سے پہلے کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ دوبارہ گیس شام ساڑھے چھے بجے آتی ہے۔'' اب کہ اکرم نے جواب دیا تھا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اُس سائیکو کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔'' حسین نے معصومانہ سی خواہش کا اظہار کیا۔ اِس بات پر نوید نے اُسے ناگواری سے دیکھا تھا۔

''کبھی منہ سے اچھی بات بھی نکال لیا کرو۔'' رضا نے اُسے گھر کا تھا۔ وہ ڈھیٹ بھی مسکراہٹ ضبط کرتے ناشتے کی جانب متوجہ ہوا۔

''تو پھر؟ کون آج کے کھانے کی ذمّے داری لے رہا ہے؟'' یہ سوال اکرم کی طرف سے آیا تھا۔

''صبر کر لو بیٹا! کم از کم ناشتہ تو سکون سے کرنے دو۔'' مقدّم نے جل کر کہا تھا۔

''میرے سر میں دو روز سے بہت درد ہے۔'' علی نے ماتھا مسلتے ہوئے کہا۔ یعنی اُسے تو کام سے دور ہی رکھا جائے۔

''آہ! مجھے صبح ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہم سے کھانا بنوانے والا ہے۔'' رضا بڑبڑایا تھا۔

''کاش! تم اُس وقت کوئی اچھی بات کہہ لیتے۔'' حسین نے سرد آہ بھرتے ہوئے اُسے لتاڑا۔

''میں آج کے لیے یہ ذمّے داری لیتا ہوں۔''عمر نے فوراً پیش کش کی تھی۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔''مقدم نے اسے تشکّر آمیز نظروں سے دیکھا تو وہ ہنسا۔

''اسکی مدر ٹریسا بننے کی عادت گئی نہیں اب تک؟''حسین نے چوٹ کی تھی تو عمر نے رک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں مدر ٹریسا کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہے؟''اُسکا سوال عجیب سا تھا۔

''سوائے اسکے کہ وہ غریبوں کے لیے درد مند دل رکھتی تھی،اور بہت خدا ترس عورت تھی۔''حسین نے اُس سے زیادہ حیرت سے بتایا۔

''نہیں! مدر ٹریسا وہ ہر گز نہیں تھی جو وہ دکھاتی تھی۔''اِس بات پر سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔پر اِس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا نوید اچانک ہی کھڑا ہوا تو تمام نظریں اپنے آپ ہی اُسکی جانب اٹھی تھیں۔

''ہمارے پاس یہاں کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے سوائے کھانا اور ناشتہ بنانے کے لیے۔تم لوگ اپنے لیے کوئی مصروفیات ڈھونڈنا چاہو تو ڈھونڈ سکتے ہو۔''اُس نے کہتے ہوئے برتن سمیٹ کر ایک جگہ اکھٹے کیے، پھر اُن کی جانب دیکھے بنا ہی راہداری کے دروازے کی جانب بڑھا۔

''انٹرنیٹ ہے نہیں یہاں، بھلا کیا ہی مصروفیات ڈھونڈیں اپنے لیے؟''یہ دکھی الفاظ حسین کے تھے۔راہداری کے دروازے پر پہنچ کر نوید رکا اور پلٹ کر اُسے دیکھا۔

''جج ور گریو نے قتل نہیں کیا تھا۔بلکہ قاتلوں کو سزا دی تھی۔''سنجیدگی سے کہتے وہ کسی کا بھی جواب سنے بغیر راہداری میں گم ہو گیا۔

''تم سب کیوں چاہتے ہو کہ میں ناول مکمل نہ کروں؟''رضا نے بیزاری سے چمچ پلیٹ میں پٹخا تھا۔

''آخر یہ جج ہے کون؟''علی نے بالآخر تنگ آ کر پوچھا تھا۔

''تمہیں کیا معلوم؟ تم نے کبھی رنگوں کی دنیا سے باہر نکل کر جاسوسی ناول پڑھے ہوں تو معلوم ہوتا۔''حسین نے جواب دیا۔

''حالانکہ جاسوسی صلاحیتیں بہترین ہیں اِسکی۔۔۔''یہ واضح بڑبڑاہٹ رضا کی تھی۔علی اُسے کوئی جواب نہ دیتا اٹھ کھڑا ہوا، ویسے بھی اُسکے سر میں کافی درد تھا۔

''چھوڑو اُس فراڈیے جج کو! مجھے یہ بتاؤ تم کیا بنا رہے ہو کھانے میں؟'' مقدّم نے پہلے اُسے پھر برتن سمیٹ کر کھڑے ہوتے عمر کو مخاطب کیا تھا۔

''دیکھتے ہیں کہ کیا بنایا جا سکتا ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ باقی سب بھی ناشتہ مکمل کر کے اٹھنے لگے تھے۔

''میں آپ کو کچن اور سامان وغیرہ دکھا دیتا ہوں۔'' کافی دیر سے رضا کو خاموشی سے گھورتے اکرم نے یکدم ہی کہا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں؟'' عمر اُسکے ساتھ چل پڑا۔ البتہ رضا کو اکرم کی نظریں خود پر محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک شے جو شاید کسی نے محسوس نہ کی۔۔۔

یا کر کے بھی نظر انداز کر دی۔۔۔

وہ ایف آئی میں اکھٹے ہونے والے دوست نہ رہے تھے۔ جنکی موجودگی میں بھی موت جیسا سناٹا رہتا تھا۔۔۔

وہ پھر وہی ہونے لگے تھے۔۔۔ کہ جنکی موجودگی میں خاموشی لمحے کو بھی نہ ٹھہر پاتی تھی۔۔۔

تو کیا دوستی پھر سے انکے درمیان میں چلی آئی تھی؟

کیا واپسی کی منزل کے مسافر، اپنی منزلوں کو پہنچ گئے تھے؟

----------+---------+--------

''انڈے، پیاز، ٹماٹر، آلو اور لہسن کے پیسٹ کی ضرورت ہے مجھے۔'' عمر نے باورچی خانے کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا۔ قدیم انٹیریئر اور جدید چیزوں سے آراستہ پیراستہ باورچی خانہ بھی اپنے آپ میں خوبصورت تھا۔

''اتنے بڑے گھر کی صفائی تم اکیلے کرتے ہو؟'' کاؤنٹر کے پاس بلاوجہ کہنیاں ٹکائے کھڑے علی نے اکرم کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں تمام سامان آپکو لا کر دے دیتا ہوں۔'' اکرم نے پہلے عمر کو جواب دیا، پھر علی کی جانب گھوما۔ ''اکیلے ہی کرتا ہوں۔ مگر چونکہ گھر استعمال نہیں ہوتا لہٰذا مہینے میں ایک بار تفصیلی صفائی کے بعد چیزوں پر چادریں ڈال کر رکھ دیتا ہوں۔ کھڑکی دروازے بھی بند رہتے ہیں

تا کہ ریت اندر نہ آئے۔ اُسکے علاوہ جب مالکان رہنے آتے ہیں، تب ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے، تو اتنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ ابھی بھی جو کمرے آپ لوگوں کے زیرِ استعمال ہیں، صرف اُنکی صفائی ہی روز ہو گی۔"اُس نے تفصیل سے جواب دیا۔ پھر رضا کو دیکھا جو فریج میں منہ ڈالے نجانے کیا تلاش کر رہا تھا؟ عمر اتنی دیر میں پیاز اُٹھا لایا تھا، اب اکرم کے دیئے گئے کٹنگ بورڈ پر رکھ کر اُسے کاٹ رہا تھا۔

"میں کچھ مدد کروں؟" رضا نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! میں کر لوں گا۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اکرم اُسکا مطلوبہ سامان نکال لایا، اور کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ پھر دوبارہ رضا کو دیکھا، جو دونوں ہتھیلیاں کاؤنٹر پر ٹکائے ذرا آگے کو جھک کر اکرم کا لایا سامان دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے چیزوں پر غور و خوص کرنے کی کیا عادت تھی؟

"باقی تینوں کہاں ہیں ویسے؟" علی کو آدھے افراد کی کمی محسوس ہوئی تو پوچھا۔

"مقدّم اور حسین تو کہیں باہر گئے ہیں۔ نوید کا معلوم نہیں!" جواب رضا نے دیا تھا۔

"صبح صبح اُٹھا دیا اِس آدمی نے۔ اتنا لمبا دن۔۔۔ کیسے گزرے گا یہاں؟" علی نے دروازے سے جھانک کر، ڈائننگ ہال میں نظر آتے گھڑیال کو دیکھتے ہوئے کہا جو صبح کے نو بجا رہا تھا۔

"کہا تو ہے اُس نے کہ اپنے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈ لو۔" عمر نے کٹے ہوئے پیاز اُٹھا کر بڑی کڑھائی میں ڈالے تھے۔

"تم بنا کیا رہے ہو ویسے؟" رضا نے تھیلے میں رکھے انڈوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اُبلے ہوئے انڈوں کا سالن!" اُس نے جواب دیا۔

"اُسے ہمارے گھر میں انڈے آلو کا سالن کہتے ہیں۔" علی نے بتایا۔

"ہمارے یہاں بھی یہی کہتے ہیں، میں نے بس تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔" اُس نے چولہے پر کڑھائی رکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔" رضا نے یکدم ہی پوچھا تو چولہے کے پاس کھڑے عمر نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ فریج کے پاس خاموش کھڑے اکرم کی نظریں اب بھی رضا پر ہی تھیں۔

''پوچھو!''اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا، علی نے اتنی دیر میں آلو اٹھا کر اسے چھیلنا شروع کر دیا تھا۔

''تمہیں واقعی کھانا بنانا آتا ہے نا؟''رضا کا لہجہ کچھ مشکوک سا تھا۔ عمر ہنس پڑا۔

''اب جیسا بھی آتا ہے، تمہیں کھانا تو یہی پڑے گا۔''چھیڑنے والے انداز میں کہتا وہ ٹماٹر کاٹنے لگا۔

''خیر! جیسا بھی ہوگا، پر چرس اور نشے سے تو بہتر ہی ہوگا اُسکا ذائقہ۔''اُس نے سکون سے کہا تو آلو چھیلتے علی نے لب بھینچے، اور نظریں اُٹھا کر رضا کو دیکھا۔ جو اُسکو آگ لگانے کے بعد سکون سے انڈوں کو ابالنے کی خاطر، اکرم کی ہی دی گئی پتیلی میں پانی بھر رہا تھا۔ عمر نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ اِس سے پہلے کے علی کوئی تپا ہوا سا جواب دیتا، اسی لمحے اکرم کی آواز کچن میں گونجی۔

''آپکا نام رضائے الٰہی ہے نا!''اس بات پر انڈے پتیلے میں سجاتے رضا نے رک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ عمر اور علی کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

''ہاں! تمہیں کیسے معلوم؟''اُس نے پوچھا۔

''میں جامعہ کراچی میں پڑھتا ہوں، وہاں مارکیٹنگ کے حوالے سے ایک سیمینار ہوا تھا، آپ اسپیکر تھے اُسکے۔ میں نے دیکھا تھا آپ کو۔'' اکرم پرجوش ہو کر بتانے لگا۔ رضا کو خوشگوار حیرت ہوئی، اُسے امید نہیں تھی کہ اکرم پڑھتا لکھتا بھی ہوگا۔

''اچھا! تو کیا پڑھتے ہو تم؟''اس نے پوچھا۔

''میں تو ڈی پی اے میں ہوتا ہوں۔''اُس نے بتایا۔

''اچھی بات ہے، اچھے سے پڑھو اور بہترین انسان بنو!''رضا نے خوشی سے کہا۔

''پر آپ ابھی نشے کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟''اُس نے کچھ پریشان کن لہجے میں پوچھا، تو رضا کی مسکراہٹ سمٹی تھی، جبکہ علی کی مسکراہٹ اُمڈ کر باہر آئی تھی۔ جسے اُس نے چہرہ نیچے کر کے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ عمر اس تمام صورتحال میں ہکا بکا سا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''شٹ!'' رضا نے زیرِلب کہا، پھر بولا۔ ''وہ دراصل! ہم آپس میں کچھ مذاق کر رہے تھے۔''اُس نے دانت نکالتے ہوئے سمجھایا تو اُس نے فقط سر ہلا دیا۔

''اچھا میں صفائی کر کے آتا ہوں، آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دیجیے گا۔'' صد شکر کہ اُس نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اُسکے جانے کے بعد علی دل کھول کر ہنسا تھا۔ رضا اُسے کینہ توز نظروں سے گھورتا واک آؤٹ کر گیا۔

اب بھلا اس میں علی کی کیا غلطی تھی؟

----------+---------+--------

''آج مجھے احساس ہوا کہ اگر انٹرنیٹ نہ ہو تو اِس شے کی کوئی وقعت نہیں ہے۔'' پہاڑ کے کنارے، جہاں سے نیچے پوری وادی نظر آ رہی تھی، کھڑے حسین نے موبائل ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

''اس میں کوئی دورائے نہیں ہے۔'' سامنے کے مناظر کو اپنے ڈی ایس ایل آر میں مقید کرتے مقدّم نے تائید کی۔ رات کے اندھیرے میں یہ دیو قامت پہاڑ اور خاموش وادی جتنی خوفناک لگتی تھی، دن کے وقت اُتنی ہی خوبصورت تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ اگر انٹرنیٹ نہیں ہوا تو ہم کریں گے کیا؟ یعنی۔۔۔ایک ہفتہ ہونے کو آیا ہے، جب میں کراچی سے نکلا تھا۔ مجھے اپنے گھر والوں کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔'' کیمرے کی آنکھ سے سامنے نظر آتی بلند و بالا چٹان کو دیکھتا مقدّم رکا، پھر پلٹ کر اُسے بغور دیکھا۔

''فرّخ صاحب نے کہا تو تھا کہ وہ ہم تک ہمارے گھر والوں کی خیریت پہنچا دیں گے۔'' اُس نے کہا۔

''لیکن پہنچائی تو نہیں!'' وہ اُداسی سے بولا۔

''فکر نہ کرو پہنچا دیں گے۔'' اُس نے تسلی دی پر حسین چپ ہی رہا۔

''منہ سیدھا کر و اپنا!'' اُس نے اُسکے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو وہ گہری سانس لیکر سیدھا ہوا۔

''مجھے ابھی یاد آیا کہ میں تم سے ناراض تھا کسی بات پر۔۔۔'' وہ اپنی پرانی ٹون میں واپس آیا۔

''مجھ سے ؟میں نے کیا کیا؟''مقدّم حیران ہوا۔

''منگنی کرلی، پرنہ بتایا، نہ بلایا۔''

''تم نے معاف کر تو دیا تھا۔''اُس نے واٹس ایپ گروپ والی گفتگو کی جانب توجہ دلائی۔

''علی کو کیا تھا صرف۔۔۔''اُس نے یاد دلایا۔

''آں۔۔۔ایسا ہے کہ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔''مقدم نے کان کھجاتے کہا۔

''میں ٹریٹ لوں گا اسکے بدلے۔''

''اس وقت ؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں !اب جب کھانا بنانے کی ذمےّ داری ہم سب پر آہی گئی ہے، تو تم کچھ اچھا سا بنا کر کھلا سکتے ہو مجھے۔''حسین نے مفت مشورہ دیا۔

''مجھے اپنے ہاتھ کے ذائقے پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔''

''پر مجھے ہے۔''

''روکھی سوکھی بھی کھلا دوں تو چلے گا؟''اُس نے چھیڑا۔

''تم پیار سے جو کچھ بھی کھلا دو چلے گا۔''

''زہر چلے گا؟'' اس معصومانہ سوال پر حسین نے اُسے سر تا پاؤں گھورا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے واپس چلتے ہیں اب !''مقدّم نے ہنستے ہوئے کہا اور حویلی کی جانب بڑھ گیا۔

----------+---------+--------

''آخر یہ دونوں گئے کہاں ہے ؟''ہال میں اِس وقت صرف اور صرف ایس ایس پی نوید عالم کی آواز گونج رہی تھی۔ صوفے پر آدھا لیٹا رضا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اپنا ناول مکمل کر رہا تھا، گاہے بگاہے نظر اُٹھا کر پنڈولم کی طرح دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکر کاٹتے نوید کو

بھی دیکھ لیتا۔ہال میں لگا گھڑیال، دن کے بارہ بجا رہا تھا۔ عمر اپنا کام مکمل کر کے، نہانے جا چکا تھا۔اس قدر سرد موسم میں علی کا تو کوئی ارادہ نہ تھا نہانے کا، لہٰذا وہ بھی ہال میں ہی ڈھیر ہو گیا۔خود عمر بھی فقط اس لیے نہانے گیا تھا تا کہ اپنے کپڑوں میں سمائی پیاز لہسن کی مہک سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

''کیا تم میں سے کسی کو بتا کر نہیں گئے یہ دونوں؟''اُس نے ایک مرتبہ پھر بے نیازی سے بیٹھے رضا اور علی کو دیکھا تھا۔

''نہیں!''

''تو تم لوگوں نے پوچھا کیوں نہیں؟''اُسکا غصّہ سوا نیزے پر پہنچا ہوا تھا۔رضا نے کتاب ذرا کی ذرا چہرے سے نیچے کر کے اُسے دیکھا۔

''کیا ہم نے تم سے پوچھا کہ تم ناشتے کے بعد سے کہاں غائب تھے؟''رضا کا سوال سیدھا سیدھا تھا۔

''میری بات الگ ہے؟''اب کہ نوید کا لہجہ پہلے سے آہستہ ہوا۔

''کیوں؟ تم سمجھدار انسان ہو؟اور وہ نا سمجھ؟''وہ بحث برائے بحث میں اُلجھا۔نوید نے لب بھینچ کر اُسے دیکھا۔

''کام ڈاؤن نوید! بچے تھوڑی ہیں دونوں، آجائیں گے واپس۔۔۔''علی نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

''بچے نہیں ہیں وہ دونوں، لیکن اتنی سی بات سمجھ نہیں آرہی کہ اس حویلی سے باہر کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔تب تک۔۔۔جب تک کہ لیے ایف آئی اے کی طرف سے کوئی کلیئرنس نہیں آجاتی۔''اصل وجہ یہ تھی۔اگلے ہی لمحے مقدّم اور حسین ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دکھائی دیے تو نوید نے سکھ کا سانس لیا، پھر سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔

''کہاں تھے تم دونوں؟''اُس نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اور دونوں کو سر تا پاؤں دیکھا۔

''ذرا تازہ ہوا میں سانس لینے گئے تھے۔''جواب مقدّم نے دیا۔

''کس سے پوچھ کر؟''اُس نے سنجیدگی سے کہا تو دونوں رکے۔

''ایکسکیوز می؟''حسین نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔مقدم کو بھی اِس سوال کی امید نہ تھی۔

''تم دونوں کواِس طرح بنا بتائے، بنا کسی سے پوچھے حویلی سے باہر جانے کی اجازت کس نے دی؟ مذاق ہے کیا تمہارے لیے؟''اُس نے جیسے غصّہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ہال کی سیڑھیوں سے نیچے آتے عمر نے کچھ حیرت سے رک کر نوید کو دیکھا جو انہیں ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلا رہا تھا۔

''تم کس سے پوچھ کر جاتے اور آتے ہو؟'' یہ دوبدو سوال حسین نے کیا تھا۔

''میں فرّخ صاحب کے حکم سے ہی آتا جاتا ہوں۔اپنے شوق کے لیے یا سیر سپاٹے کے لیے نہیں!''اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔اُسکا انداز وہاں موجود ہے شخص کو ناگوار گزرا تھا۔

''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''حسین کو اب واقعی غصّہ آ رہا تھا۔''تم ہمیں یہاں حفاظت کے لیے لائے ہو یا قید کرنے کے لیے؟''

''ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم سے پوچھ کر یہاں سے باہر نکلنا ہے۔آئندہ خیال رکھیں گے۔''مقدّم نے دونوں کو ایک دوسرے سے اُلجھتا دیکھ کر فوراً صلح جو انداز میں کہا۔

''پوچھ کر نہیں! پر اطلاع تو دے دو کہ کہاں جا رہے ہو؟ میں تم سے رابطہ نہیں کر پا رہا صبح سے۔''اب کہ نوید نے اپنے لہجے پر قابو پایا۔ درحقیقت وہ پریشان تھا۔

''کیسے رابطہ کروگے؟ تم نے ہی یہ نیٹ ورک اور انٹرنیٹ پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔''حسین عجیب سے انداز میں کہتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔غالباً وہ ناراض ہو چکا تھا۔

''یہ سب صرف تم لوگوں کی حفاظت کے لیے ہے۔ہو سکتا ہے ایک دو دنوں میں انٹرنیٹ استعمال کرنے کی،اور گھر والوں سے بات کرنے کی اجازت مل جائے۔''نوید نے وہاں موجود باقی لوگوں کو دیکھتے ہوئے وضاحت دی،آواز حسین تک بھی گئی تھی اور وہ بنا کوئی جواب دیئے جا چکا تھا۔

''کوئی بات نہیں! ہم سمجھتے ہیں۔''مقدّم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔نوید نے سر ہلاتے اوپر نظر آتی راہداری کو دیکھا تھا۔نجانے حسین کو اچانک سے کیا ہوا تھا؟ وہ تو اتنی جلدی ہر بات کا برا نہیں مانتا تھا۔یا شاید وہ صرف نوید کی ہی باتوں کا برا ماننے لگا تھا۔

صبح صبح ناشتہ کرنے کا نقصان یہ ہوا کہ بھوک جلدی لگ گئی۔ دوپہر ایک بجے کے قریب اکرم نے کھانا لگا دیا تھا۔

''تم صبح کچھ کہہ رہے تھے؟'' کھانے کے دوران علی نے عمر کو مخاطب کیا تھا۔ اب خاموشی اُنکے لیے مشکل ہو گئی تھی۔ بنا مخاطب کیے گزرا نہ رہا تھا۔ خاموشی اُنہیں خیر آباد کہہ چکی تھی شاید۔

''میں؟ کیا کہہ رہا تھا؟'' اُسے یاد نہ آیا۔

''تم مدر ٹریسا کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟'' اُس نے یاد دلایا۔

''اوہ ہاں! تمہیں واقعی مدر ٹریسا کے بارے میں نہیں معلوم حسین؟'' اُس نے خاموشی سے کھانا کھاتے حسین کو مخاطب کیا۔ اس مرتبہ سربراہی کرسی کے بجائے، علی کے برابر والی کرسی پر بیٹھے نوید نے بھی بغور اُسے دیکھا تھا۔

''نہیں! میں بھلا اور کیا ہی جانوں گا آنٹی ٹریسا کے بارے میں؟'' اُس نے کندھے اچکاتے اپنے ازلی انداز میں کہا۔

''مدر ٹریسا نے اپنے اداروں میں کتنے ہی بیمار لوگوں کی تیمارداری کی، لیکن کبھی کسی کا علاج نہیں کروایا۔ حالانکہ وہ لاکھوں ڈالر فنڈز، اُنکے علاج کی مد میں لوگوں سے وصول کرتی تھی۔ وہ انکا علاج نہ کروانے کی ایک ہی وجہ دیتی تھی، کہ بیمار افراد کو یسوع مسیح کی طرح دکھ اور تکلیفیں برداشت کرتے رہنا چاہیے۔ اُس نے کولکتہ کے کتنے ہی ہندوؤں کو بلیک میل کر کے عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا، وہ اُنہیں کہتی تھی کہ تم عیسائیت قبول کرو گے تو جلد ہی شفا پاؤ گے۔ اُسکے پاس موجود ہزاروں مریض ایسے تھے جو قابلِ علاج تھے، مگر ٹریسا نے انکو زبردستی تکلیفوں اور اذیتوں میں رکھ کر اپنا عقیدہ اُن پر تھوپا۔ اُسکے نزدیک انسان جتنا زیادہ تکلیف میں ہو گا اتنا زیادہ خدا سے قریب ہو گا، اِس لیے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ اس شیطانی ہتھکنڈے کے ذریعے مدر ٹریسا نے نہ صرف بھارت سمیت دنیا بھر میں ہزاروں لوگوں کو عیسائی بنایا بلکہ اس نے خاص طور پر ہندو مذہب کو شدید نقصان پہنچایا کیونکہ اس کے شکار کی اکثریت ہندو تھی۔'' یہ انکشاف بہت خوفناک تھا۔

''کیا اُسکی زندگی میں اُس پر یہ تنقید ہوئی تھی؟'' علی نے پوچھا۔

''ہاں! اور اُن تمام تنقیدوں کے جواب میں، مدر ٹریسا نے کہا کہ غریبوں کا اپنا دکھ قبول کرتے ہوئے، مسیح کے جذبے کی طرح دکھ جھیلنا ایک خوبصورت احساس ہے۔ دنیا ان کے دکھوں سے بہت کچھ حاصل کرتی ہے۔ البتہ، جب اپنی تکلیف کی بات آئی تو اُس نے بالکل مختلف موقف اختیار کیا۔ جب اُسے دل کے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑا، تو اس نے ایک جدید امریکی ہسپتال میں اپنا علاج کروایا۔ یہ ٹریسا کی تضحیک اور جھوٹ کی ایک اور مثال ہے، جو سیکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوئی۔'' عمر نے مزید بتایا۔

''تو لوگ اُسے فنڈز دیتے ہی کیوں تھے؟ اور وہ اُن معصوم لوگوں تڑپا تڑپا کر مار کے کیا حاصل کرنا چاہتی تھی؟'' رضا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مدر ٹیرسا کی شیطانیت کی داستان بہت لمبی ہے، اُسکو پیسہ دینے والے زیادہ تر حکومت اور امرا طبقے کے شدید کرپٹ لوگ تھے۔ مسیحیت کا راگ الاپنے والی ٹیرسا نے اِس تنقید کا جواب بھی اس طرح دیا کہ مجھے کسی کی کمائی کے ذرائع سے مطلب نہیں ہے، مجھے غریبوں کے لیے امداد کی ضرورت ہے۔ جبکہ جرمن میگزین سٹرن کی 1991 کی ایک رپورٹ میں یہ بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ اسے ملنے والے لاکھوں ڈالر میں سے صرف سات فیصد خیراتی کاموں کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔''

''کل تعداد کا صرف سات فیصد؟'' اُنکے منہ حیرت سے کھلے تھے۔

''بالکل! دنیا کبھی نہیں جان سکی کہ وہ پیسے کہاں گئے؟ اُسکو پیسے دینے والوں کی اکثریت انسانیت سوز حرکات میں ملوث بھی تھی۔ بہت سی ادارہ صحت کی رپورٹوں میں یہ بھی انکشاف ہوا کہ ٹیرسا کے یہاں صحت اور علاج کا نظام انتہائی ناقص تھا، کچھ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ علاج کے دوران ایک ہی سرنج کا استعمال کئی لوگوں پر کرتی تھی، بستر گندے اور اکثر دوائیں سرے سے موجود نہیں ہوتی تھیں۔ حالانکہ جتنے اُسکے فنڈز تھے، اُسکا ادارہ سب سے زیادہ جدید ہونا چاہیے تھا۔''

''یہ کچھ کچھ جیفری ایپسٹین جیسا ہے۔'' کافی دیر سے خاموش نوید نے کہا تھا۔ اس تبصرے پر سب نے اُسے حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ گفتگو میں کم ہی حصہ لیا کرتا تھا۔

''وہ کیسے؟'' عمر نے سب کی زبانوں کا سوال اُس سے کیا۔

''ایپسٹین کیا کرتا تھا؟ انسانوں کی قربانیاں دے کر اپنے کسی شیطان بعل کو خوش کرتا تھا، اُسی کو پیسے بھی دیا کرتا تھا۔ اُسکو پیسے دینے والے دنیا کے نامور لوگ تھے۔ تم غور کرو تو ٹریسا نے بھی تو یہی کیا ہے۔ اُس نے معصوم لوگوں کو مرنے دیا، اور اُسے پیسے دینے والے اپنے وقت کے مشہور ترین کرپٹ لوگ تھے۔ اور اُن پیسوں کا کوئی حساب بھی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ سمپل! یہ سب شیطان کے پیروکار ہیں۔''اُس نے ایک بالکل ہی الگ نوعیت پر بات کی تھی۔ پر بات اُسکی کچھ کچھ درست معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایسے بات کر رہے تھے، جیسے دس سال اُنکے درمیان کبھی آئے ہی نہ تھے۔

''یہ سب تو رونگٹے کھڑے کر دینے والے انکشافات ہیں۔'' مقدّم نے جھرجھری لی تھی۔

''آج سے میں تمہیں عبدالستار ایدھی کہوں گا۔'' حسین نے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنسا۔

''اُنکے جیسے لوگ صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔'' رضا نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا تو سب نے تائید کی۔

''کھانا اچھا تھا ویسے!'' مقدّم نے عمر کی تعریف کرنا ضروری سمجھا۔ وہ بس مسکرا دیا۔

--------+---------+----------

سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد اکرم اپنی خوشی سے سب کے لیے اپنے گھر سے چائے بنا لایا تھا۔ اُسکے پاس سلینڈر تھا لہٰذا اُسکے لیے چائے بنانا مشکل نہ تھا۔ چائے پینے کے بعد نوید پھر کہیں غائب ہو چکا تھا۔ جبکہ باقی پانچوں ہال میں موجود تھے۔

''یہ کہاں آتا جاتا ہے آخر؟'' مقدّم، نوید کی غیر موجودگی پر مشکوک تھا۔

''بڑے لوگ ہیں وہ، بتا کر تھوڑی جاتے ہیں۔ ساری پابندیاں تو بس ہمارے لیے ہی ہیں۔'' صوفے پر آڑھا ترچھا لیٹا حسین بیزاری سے بولا تھا۔

''چھوڑو ان سب باتوں کو، یہ بتاؤ کہ کیا ہم یوں ہی فارغ بیٹھ بیٹھ کر اگلا ایک ماہ گزاریں گے؟'' عمر نے موضوع بدلنا چاہا۔

''ہم بھلا کیا ہی کر سکتے ہیں یہاں؟ فارغ بیٹھنے کے علاوہ!'' علی نے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے پوچھا۔ اُسکے سر میں ایک بار پھر درد اُٹھ رہا تھا۔

''گھر کی صفائی شروع کر دیں؟'' حسین نے مفت مشورہ دیا، اُسکے برابر بیٹھا رضا جیب سے سگریٹ نکال کر جلا چکا تھا۔

''ہاں ! اُسکے بعد کپڑے بھی دھوئیں گے اور پھر لان کی کانٹ چھانٹ بھی کر لیں گے۔ ''مقدّم نے اُسکا جملہ مکمل کرتے، ایک نظر سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے رضا کو دیکھا۔

''تمھیں شرم نہیں آتی ؟'' مقدّم نے سنجیدگی سے اُس کو مخاطب کیا۔

''ہر گز نہیں !'' رضا اچھے سے اُسکا سوال سمجھ گیا تھا، اِس لیے ڈھٹائی سے بولا۔

''اِس طرح سب کے درمیان بیٹھ کر سگریٹ پینا بالکل نامناسب عمل ہے۔'' اُس نے احساس دلانا چاہا۔

''تم کھڑے ہو کر پی لو۔'' حسین نے ایک اور مشورہ دیا تو مقدّم نے اُسے گھورا۔

''سگریٹ فقط عورتوں، بچوں اور بزرگوں کے درمیان بیٹھ کر پینا نامناسب عمل ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمھیں ان میں سے کس کیٹیگری میں رکھوں ؟'' رضا نے سنجیدگی سے پوچھا تو عمر اور مقدّم نے تاسف سے اُسے دیکھا تھا۔

''یہ صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی ہے۔'' عمر نے بھی سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میرے علم میں اضافے کے لیے شکریہ ! مجھے یہ بات آج پتہ چلی ہے۔'' اُس نے سگریٹ کا ایک اور کش لیتے ہوئے کہا۔

''خاموش نہیں رہ سکتے کچھ دیر کو، میرے سر میں بہت درد ہے۔'' کافی دیر سے چپ بیٹھا علی یکدم ہی بولا تھا۔

''اتنا درد کیوں ہے تمہارے سر میں کل سے ؟'' عمر کو تشویش لاحق ہوئی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، رضا نے اچانک ہی سگریٹ کا ڈبہ اپنی دائیں جانب بیٹھے علی کی طرف بڑھایا اور بولا۔

''پیو گے ؟'' اِس دوستانہ پیشکش پر جہاں سب کا منہ کھلا تھا، وہیں علی نے سر تا پاؤں اُسے گھورا تھا۔

''نہیں !'' وہ جواب دیتا واپس اپنا ماتھا مسلنے لگا۔

''بھری ہوئی نہیں ہے۔'' اُس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا تو حسین بیساختہ ہی ہنسا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' علی نے لب بھینچتے ہوئے کہا۔

''میں نے نشمیہ سے وعدہ کیا ہے کہ میں سگریٹ نہیں پیوں گا۔ بس اِس لیے منع کیا۔''اُس نے مزید وضاحت دی تو اُس نے کندھے اُچکاتے پیشکش واپس لے لی۔

''یہ تم نے ایک اچھا فیصلہ کیا۔''عمر خوش ہوا تھا۔

''تم بھی کوئی سبق حاصل کر لو۔''مقدّم نے ایک بار پھر رضا کو شرم دلانا چاہی۔

''پہلے ایس ایس پی نوید عالم کو سبق دو جو یہی کام کرنے کے لیے باہر لان میں موجود ہے۔''اُسے بھلا کیا فرق پڑنا تھا؟

''اوہ! تو وہ یہ کام کرنے گیا ہے؟''علی حیران ہوا۔

''کم از کم سب کے درمیان بیٹھ کر تو نہیں پی رہا۔''مقدّم نے ایک مرتبہ پھر اُسے طنز کا نشانہ بنایا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں بچہ سمجھتا ہو؟''رضا نے طنز خاطر میں نہ لایا۔

''یا پھر بزرگ؟''حسین نے لقمہ دیا۔

''یا پھر؟۔۔''اس مرتبہ رضا اور حسین دونوں نے ایک ساتھ جملہ ادھورا چھوڑ کر مقدّم کو دیکھا۔

''شٹ اپ!''اُس نے خجل ہوتے ہوئے کہا تو دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے۔

مقدّم دانت کچکچا کر رہ گیا۔

--------+---------+----------

رات کے کھانے پر نوید نہیں آیا، بلکہ ہال میں اپنے دو عدد لیپ ٹاپ، اور کچھ فائلز وغیرہ کھول کر بیٹھا رہا، کسی نے اُسے بلانے کی زحمت بھی نہ کی، عمر میں تھوڑی انسانیت جاگی تھی پر مقدّم نے اُسے یہ کہہ کر سلا دیا کہ

''رات کے کھانے کے بارے میں سب کو علم ہے، دعوت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ بھی خاموش ہو گیا۔

خلاف توقع حسین بھی نہیں آیا تھا میز پر، رضا کو حیرت ہوئی تو جا کر پوچھ آیا۔ اُس نے طبیعت خرابی کا کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا۔ رضا اُسکا انکار کبھی نہ سنتا پر اُس لمحے اُسکا چہرہ واقعی سرخ اور انداز عجیب سست سا تھا۔ لٰہذا وہ واپس آ گیا۔

''تم کھانے کے بعد سونے جا رہے ہو؟'' کھانے کے دوران عمر نے علی سے پوچھا تھا۔

''جاگ کر کرنا بھی کیا ہے؟'' علی نے گہری سانس لیتے ہوئے برتن اُٹھایا۔

''چلو! تمہیں حویلی کی لائبریری دکھاؤں، میں نے اور مقدّم نے شام میں ہی دریافت کی ہے۔'' اُس نے کہا تو علی حیران ہوا۔

''حویلی میں لائبریری بھی ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''حویلی میں جم بھی ہے۔'' مقدّم نے اُسکے علم میں اضافہ کیا۔

''تو تم لوگوں نے حویلی گھوم بھی لی؟'' علی مزید حیران ہوا۔

''ابھی کہاں؟ ابھی تو حویلی کا ایک حصّہ ہی دیکھا ہے، اکرم بتا رہا تھا کہ حویلی کے اندر اپنی ذاتی مسجد بھی موجود ہے۔'' مقدّم نے بتایا۔ حویلی تھی کہ پورا قصبہ؟

''آج سر میں درد ہے کافی، کل نیند بھی پوری نہیں ہو سکی تھی۔ اِس لیے آج کے لیے معذرت! کل تمہارے ساتھ لائبریری دیکھ لوں گا۔'' علی نے عمر سے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں!'' اُس نے خوش دلی سے قبول کی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے، نوید اپنے مختلف کیسسز کے بارے میں فراہم کردہ معلومات کو پڑھ کر اُسکے کچھ پوائنٹس وغیرہ بنانے کے بعد اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھا اور ایک نظر اوپر ریلنگ سے نظر آتی راہداری کو دیکھا، پھر ہال کا دروازہ اچھے سے بند کرنے کے بعد وہ بھی اوپر آ گیا۔ راہداری سے گزرتے، اُس نے ایک اچٹتی سی نگاہ باقی دو کمروں پر ڈالی، مقدم اپنے بستر پر بیٹھا، اپنے کیمرے کے ساتھ مصروف تھا، ساتھ میز پر عمر اپنا ٹیبلیٹ لیے یقیناً اپنے ڈیزائن پر کام کر رہا تھا۔ آگے والے کمرے میں رضا اپنا بقیہ ناول مکمل کر رہا تھا۔ جبکہ علی سر تک لحاف تانے لیٹا تھا۔ نوید اپنے کمرے میں پہنچا تو ٹھنڈ بڑھ چکی تھی۔ حسین لحاف سینے تک ڈالے، آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ نوید کو آتا دیکھ کر اُس نے ذرا کی ذرا بازو آنکھوں سے

ہٹا کر اُسے دیکھا، پھر دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن میں لیٹ گیا۔ نوید نے کمرے کا دروازہ بند کر کے، لیپ ٹاپ الماری میں رکھا، اور کمرے میں لگا ہیٹر چلا دیا۔ پھر اپنا سیاہ جیکٹ اُتار کر پلنگ کے سرہانے رکھتا خود بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ حسین اُسی طرح آنکھوں پر بازو ٹکائے بے حس و حرکت پڑا رہا، ہیٹر چلنے کی وجہ سے ماحول کچھ بہتر لگنے لگا تھا۔

''تم نے رات کا کھانا کیوں نہیں کھایا؟'' نوید کی آواز کمرے میں گونجی تو حسین کے وجود میں حرکت ہوئی وہ لحاف ہٹاتے اُٹھ بیٹھا۔

''کیا مجھے سونے جاگنے، باہر آنے جانے، کھانا کھانے یا نہ کھانے، اپنے ہر عمل کے لیے تمہیں جواب دینا پڑیگا؟'' اُسکا لہجہ تیز اور تلخ تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، نوید حیران سا اُسے دیکھے گیا۔

''کیا اسی طرح ہر بات پر سوال جواب کرو گے تم؟'' اُس نے ناراضگی سے کہا۔ نوید خاموش رہا، حسین نے اُسے کاٹ دار نظروں سے دیکھا اور چہرے تک لحاف ڈال کر کروٹ بدل کر دوبارہ لیٹ گیا۔ نوید لب بھینچے اُسے دیکھتا رہا، حسین غصّہ نہیں کرتا تھا، پر آجکل اُسکا غصّہ، چڑچڑا پن، بیزاری سب ایک ساتھ نکل کر باہر آ رہا تھا۔ اور اسکا نشانہ صرف ایک ہی شخص بن رہا تھا، وہ تھا نوید عالم!

حسین کو اس چیز کا احساس تھا، وہ احساس کرنا جانتا تھا۔ لیکن اُسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے؟ نوید کو دیکھ کر بلا وجہ ہی غصّہ آنے لگتا تھا۔ یکدم ہی کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو اُس نے لحاف چہرے سے ہٹاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا، اور نوید کمرے میں کہیں نہیں تھا۔ اُسے افسوس ہوا، کیا ضرورت تھی اتنا کچھ بولنے کی؟ اُس نے سر پر ہاتھ رکھ کر انگلیوں سے ماتھا مسلا اور سیدھا لیٹ گیا۔ شام سے ایسے ہی کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا، پر کسی طریقے سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ نجانے کیا ہوا تھا؟ صبح تک تو سب ٹھیک تھا۔ وہ اپنی کیفیت پر غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور وہ واپس اندر آیا۔ ہاتھ میں کھانے کی دو عدد پلیٹیں تھیں، اندر داخل ہو کر اس نے جوتے کی نوک سے دروازہ بند کیا اور میز پر دونوں پلیٹیں رکھ کر براہِ راست حسین کو دیکھا، جو اُسکی تمام کاروائی خاموشی سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

''میں نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا ہے، آ جاؤ! ساتھ کھا لیتے ہیں۔'' اُس نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، جیسے حسین سے کتنا پرانا یارانہ ہو۔ خیر یارانہ تو تھا!

''مجھے نہیں کھانا!'' اُس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے بیزاری سے کہا۔

''میں نے کھانا یہیں رکھ دیا ہے، موسم ٹھنڈا ہے خراب نہیں ہو گا یہ، تمہیں جس وقت بھوک لگے کھا لینا۔''نوید نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کھانا شروع کر دیا۔ وہ خاموش ہی رہا، نوید کا ہر انداز اُسکی سمجھ سے بالاتر تھا۔

کمرے کے باہر راہداری ہمیشہ کی طرح خاموش پڑی تھی، پیلی روشنیوں میں نہائی راہداری آج بہتر لگ رہی تھی، محرابی کھڑکی کے باہر باغیچہ بھی خاموش تھا۔ لیکن نوید کے ساتھ والے چار کمرے چھوڑ کر آگے علی اور رضا کا کمرہ اتنا خاموش ہرگز نہ تھا جتنی راہداری۔

''میں تمہارے اعلیٰ ظرف ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔''اپنے پلنگ پر بیٹھا پیکٹ والی مونگ پھلی سے انصاف کرتا علی مزے سے کہہ رہا تھا۔

''تم تو سو نہیں رہے تھے؟''اگاتھا کرسٹی کے ناول سے نظریں اٹھا کر رضا نے اُسے گھورا، ناول اختتام کی طرف تھا۔ اور اس وقت وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔

''نیند تو آرہی ہے، پر کہا نا! تمہارے اعلیٰ ظرف ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔'' حالانکہ وہ اپنے سر درد کی وجہ سے اٹھ بیٹھا تھا۔ پر سامنے موجود شخص کو چڑانے اور تپانے کا موقع بار بار کہاں ملتا تھا؟

''تم نے کل ہی اعتراف کیا تھا کہ میں اعلیٰ ظرف ہوں۔ اِس لیے میں نے مزید اعلیٰ ظرفی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔''رضا نے کتاب کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا کب کہا؟''علی حیران ہوا، رضا نے اُس سے بھی زیادہ حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میں نے کہا تھا کہ تم اتنے کم ظرف بھی نہیں ہو۔ یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ تم اعلیٰ ظرف ہو۔''اُسے خود کو گھورتا پا کر علی نے مزید تپایا۔

''ایک ہی بات ہے۔''اُس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''دو مختلف باتیں ہیں۔''اُس نے انکار کیا۔

''تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھے معاف کر چکے ہو۔''اُس نے یاد دلایا۔

''ہاں! کہا تھا پر تم نے بھی کہا کہ تم سب کے سامنے مجھ سے معافی مانگو گے تو میں نے پیشگی معافی کا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔'' وہ موڈ میں تھا۔

''میں نے بھی اعلیٰ ظرفی کا ارادہ ترک کر دیا ہے، لہٰذا تم منہ بند کر کے سو جاؤ اور مجھے کتاب پڑھنے دو۔'' اُس نے چڑے ہوئے انداز میں کہا تو علی نے مزید تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ پیکٹ والی مونگ پھلی اُسکی جانب بڑھائی اور آنکھ کے اشارے سے لینے کی پیشکش کی۔

''نہیں!'' رضا نے پیشکش ٹھکرا دی۔

''زہر نہیں ہے اس میں!'' اُس نے یقین دلاتے انداز میں کہا تو رضا نے اُسے سنجیدگی سے گھورا۔ اُس نے کندھے اچکاتے پیشکش واپس لے لی۔

بدلہ پورا ہوا!

کمرے سے باہر راہداری ایک مرتبہ پھر خاموش تھی، راہداری کے شروع میں بنا کمرہ کھلا ہوا تھا۔ مقدّم اپنا کام مکمل کرنے کے بعد عمر کے ٹیبلیٹ میں جھانکتے، اُسکا سر کھانے میں مصروف تھا۔ یہ ڈیزائن کیا ہے؟ یہ کونسا سوفٹ ویئر ہے؟ یہ کیسے کیا تم نے؟ اُسکے ڈھیروں سوالات تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

''تم چائے پیو گے؟'' اُسکی بک بک سے تنگ آ کر عمر نے پوچھا۔

''ہاں! بلکہ میں بناتا ہوں تمہارے لیے۔'' اُس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''چلو! میں بھی ساتھ آتا ہوں۔ یہاں گیس گیارہ بجے جاتی ہے۔'' عمر کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''ہاں! کراچی میں تو دس بجے چلی جاتی تھی۔ خیر کراچی تو اب بھی جاگ رہا ہو گا، اور یہاں آدھی رات کا سا سماں ہے۔'' پہاڑوں میں گھرے مقدم کو شہر کی رونقیں یکدم ہی یاد آئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو باورچی خانے تک آئے۔ کمرے سے باورچی خانے تک آنے میں چھ سے سات منٹ لگتے تھے۔

''کسی اور سے بھی پوچھ لینا چاہیے؟'' عمر نے کہا کہ شاید کسی اور کو بھی چائے کی طلب ہو۔

''اس وقت میں یہاں سب کی چائے بنانے نہیں آیا۔'' کیتلی چولہے پر چڑھاتے مقدّم نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی، عمر نے تاسف سے اُسے دیکھا پر کہا کچھ نہیں۔

''ایک بات پوچھوں؟'' عمر نے اسے بغور دیکھتے پوچھا۔

''سو باتیں پوچھو!'' وہ کیتلی میں پتی ڈالتے بولا۔

''ہم جب ایف آئی اے میں ملے تو ایسے تھے جیسے بہت سے اجنبی ساتھ بیٹھے ہوں۔ اور آج؟'' اُس نے سوال دانستہ ادھورا چھوڑا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔'' مقدم نے اُسکی جانب رخ کرتے ہوئے سلیب سے ٹیک لگائی اور سینے پر بازو باندھتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''علی نے مجھ سے معافی مانگی، مجھے خود گلے لگایا اور مجھے بھائی کہا۔'' عمر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''پر کیا باقی سب بھی؟ یعنی۔۔۔ میرا مطلب ہم نے بیٹھ کر وہ معاملہ حل نہیں کیا اب تک، تو پھر ہر شے اپنی جگہ پر کیوں محسوس ہو رہی ہے؟''

''بعض معاملات بیٹھ کر حل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہونا کافی ہوتا ہے۔ حسین نے پہل کرنے میں سب سے پہلے قدم بڑھائیں تھے۔ کیونکہ وہ ایسا ہی ہے، ہمیشہ سے۔ میں نے جان کر سب کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر کیے ہیں۔ کیونکہ اس جھگڑے کے دوران میں موجود نہیں تھا۔ میرے لیے تم سب ہمیشہ سے میرے دوست تھے۔ تم نے کبھی نہ چاہا تھا کہ تمھارے دوستوں میں جھگڑا ہو، اس لیے تم نے ناراضگی کبھی نہ دکھائی، بس خاموش رہ کر سب کے پلٹ آنے کا انتظار کرتے رہے۔ علی نے زبانی نہ صحیح پر دل میں کہیں نہ کہیں یہ تسلیم کر لیا ہے کہ غلطی اُسکی زیادہ تھی۔ لہٰذا وہ چیزوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور رہی بات رضا کی۔ تو رضا نے ایک لمبے عرصے کھل کر سانس نہیں لی تھی۔ اس نے اپنا بچپن، اپنا لڑکپن اور اپنی جوانی ہمیشہ ایک خوف کے سائے میں گزارے ہیں، کہ کہیں اُسکا بچپن کسی کو پتہ نہ چل جائے، کہیں لوگ اُسے لعن طعن نہ کریں، اُسکے بارے میں الٹا سیدھا نہ سوچیں۔ پر اس دن اُسکا یہ سالوں کا خوف ختم ہو گیا۔ اُس نے جان لیا کہ اسکے بارے میں سب جان کر بھی دنیا میں کچھ لوگ موجود ہیں، جو اس سے محبت کرتے ہیں، اُسکے تکلیف دہ ماضی کے باوجود۔ لہٰذا اُسکا سالوں پرانا خوف ختم گیا۔ وہ بھی انسان ہے، ہماری طرح کا ایک عام انسان۔ خوش رہنا اُسکا بھی حق ہے۔ اور اُس نے اپنا حق پہچان لیا ہے۔ اُس نے جان لیا ہے جو لوگ اُس سے محبت کرتے ہیں، اُنہیں کھونا بیوقوفی ہے۔ لہٰذا وہ بھی

تعلقات بہتر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب کا اپنا اپنا انداز ہے، زبان سے کوئی نہیں کہہ رہا پر سب ہی دوستی زندہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اور چیزیں بہتر اچانک سے نہیں ہوئیں عمر! ہر شے آہستہ آہستہ ہوئی ہے۔ پچھلے چھ ماہ میں قدرت ہمیں بار بار سامنے لائی ہے۔ ہماری دوستی ری نیو (دوبارہ نئی) کرنے کے لیے۔ ہم نے تب ہی اپنے درمیان دیوار گرادی تھی جب نوید کو گولی لگی تھی، جب علی کی بیٹی لاپتہ ہوئی تھی، جب ہمیں نوید کے بارے میں پتہ چلا تھا اور جب ہم سمجھے تھے کہ رضا نے خود کو ختم کر لیا۔ وہ ہمارے درمیان ناراضگی کی آخری رات تھی۔ ہم اسی دن سمجھ گئے تھے کہ اگر ہم میں سے کسی کو کچھ ہوا تو کوئی ایک بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اتنا آسان نہیں ہوتا چھ سالوں پر محیط تعلق ختم کرنا اور سب بھلا دینا۔'' مقدّم نے نرمی سے تمام باتیں کہیں تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''اور نوید؟ نوید کا ذکر نہیں کیا تم نے؟'' عمر نے بغور اسے دیکھتے پوچھا۔

''نوید اظہار کے معاملے میں ہمیشہ سے چور رہا ہے عمر! اور جتنی اذیت وہ سہہ چکا ہے، سنجیدگی اب اُس کا خاصا بن چکی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اسے ہماری فکر نہیں ہے۔ اُسے ہے، بس وہ کہنا نہیں جانتا۔'' وہ اپنے دوستوں کو بہت اچھے سے جانتا تھا۔ اُس نے کہہ کر کیتلی کی جانب دوبارہ رخ کیا، پھر ابلتی ہوئی چائے میں دودھ ڈالنے لگا۔ عمر بھی چھت کی جانب دیکھنے لگا۔

''یہ حویلی کتنی خوبصورت ہے؟'' اُس نے کچن کی چھت پر بنے نقش و نگار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے، میرے دادا کا گھر سوات میں تھا۔ میرے دادا لیلیٰ کے بھی رشتے میں نانا لگتے تھے۔ دادا کا گھر ایسا ہی تھا بالکل، وہ بھی اسی قسم کا فن تخلیق تھا۔ بہت خوبصورت اور بہت سحر انگیز سا۔ سب سے خوبصورت تو ان کا باغ تھا۔ ہزاروں ایکڑ پر مشتمل۔۔۔۔ میں اور لیلیٰ اس میں بہت کھیلتے تھے۔'' اس نے غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے کہا تھا۔ چائے اُبلنے لگی تو اس نے آنچ کم کی۔ پتی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو سارے میں پھیلنے لگی۔

''بھول جاؤ اُسے، دل میں کسی اور کو رکھ کر کسی اور کے ساتھ زندگی شروع نہیں کی جاتی۔'' عمر نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

''یاد کرنے میں حرج بھی نہیں ہے۔'' اُس نے ہلکے پھلکے سے لہجے میں کہتے کندھے اچکائے۔ عمر اب کہ کچھ نہ بولا۔

''یہ بتاؤ! جس رات ہم اسلام آباد میں رکے تھے، اُس رات تم لیونگ روم میں بیٹھے کیا کرتے رہے تھے؟ وہ بھی ساری رات؟'' ٹرے میں چائے کے دو عدد بڑے مگ رکھتے ہوئے مقدم نے پوچھا۔

''نیند نہیں آرہی تھی تو باہر آکر بیٹھ گیا تھا۔''اُس نے کہا۔

''کیوں نیند نہیں آرہی تھی؟''اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ایک بار پھر سلیب سے ٹیک لگائی اور اُسے دیکھا۔

''پریشان تھا میں، امی ابّو کو سب سچ بتا کر بھی ایک بار پھر اُن سے جھوٹ بولا ہے۔ وہ الگ میرے لیے فکر مند ہونگے۔ بس! یہی سب سوچ رہا تھا اور زیادہ سوچنے سے سر میں درد اٹھنے لگتا ہے۔''اُس نے سچ بتایا۔

''تم سب لوگ بھی مریض بن چکے ہو پورے، علی الگ سر درد کا رونا رو رہا ہے کل سے، رضا کے بارے میں معلوم ہوا کہ نیند کی دوائیں لیے بنا وہ سوتا نہیں ہے۔ کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟''مقدّم نے تھوڑے دکھ سے کہا، عمر کچھ کہنے کے لیے منہ کھول ہی رہا تھا کہ اُسی لمحے باورچی خانے کے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔ دونوں نے ایک ساتھ دیکھا تو سامنے رضا تھا۔

''اوہو! بیڈ ٹائم ٹی؟''وہ مقدّم کو چائے بناتے دیکھ کر چھیڑتا ہوا بولا اور چولہے کے قریب آکر کچھ تلاشنے لگا۔ آج کل اُسکے انداز بھی نرالے تھے، حیران کرتے ہوئے سے۔

''تم پیو گے؟''مقدّم نے کھلے دل سے پیشکش کی تو عمر نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا، ابھی تو کہہ رہا تھا کہ اور کسی کے لیے نہیں بناؤں گا۔

''نہیں! میں رات کو چائے نہیں پیتا۔''رضا دراز یں کھولتا مصروف سے انداز میں بولا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو آخر؟''مقدّم نے اُسکی تلاش سے تنگ آکر پوچھا۔

''ماچس!''اُس نے کیبنٹ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

''یقیناً! سگریٹ پینی ہو گی؟''عمر نے افسوس سے اُسے دیکھا۔

''بالکل!''اُسے پہلے کب فرق پڑا تھا جواب پڑتا۔

''کیوں اپنی صحت کے ساتھ کھیل رہے ہو؟ چھوڑ دو اس بیکار شے کو!''عمر بھی اُسے نصیحت کرنا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ رضا نے کیبنٹ بند کرتے ہوئے مڑ کر اُسے دیکھا۔

''یہ نصیحتیں تم نے اپنے بزنس پارٹنر (کاروباری شراکت دار) کو کتنی بار کی ہیں اب تک؟''اِس سوال پر عمر نے اپنا کان کھجایا۔

''وہ۔۔۔وہ میری بات سنتا نہیں ہے نا!''اس نے وضاحت دی۔

''تو میں کونسی سنتا ہوں؟''رضا نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

''تم لوگوں کو سمجھانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔'' بالآخر وہ بھی ہار مانتے سلیب سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''مل گئی۔''رضا نے چولہے کہ برابر رکھی ماچس اٹھاتے ہوئے کہااور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''شرم تو نہیں آرہی ہو گی؟''مقدّم نے پیچھے سے کہا۔

''بالکل نہیں!''وہ بنامڑے کہتا راہداری میں گم ہو گیا تھا۔

----------+---------+--------

الارم کی چنگھاڑتی آواز سے اُسکی آنکھ کھلی تو وہ فوراًاُٹھ بیٹھا، صبح کے پانچ بج رہے تھے۔الارم بند کر کے اس نے چہرہ موڑ کر ساتھ والے بستر پر سوئے حسین کو دیکھا۔وہ ساری رات بے چین رہا تھا، پر اب پر سکون سا سویا ہوا تھا۔نوید بنا آواز پیدا کیے اٹھااور واشروم کی طرف بڑھ گیا۔پھر وضو کر کے باہر آیا، نماز ادا کرنے کے بعد وہ اتنی ہی آہستگی سے باہر آگیا۔باہر راہداری سنسان پڑی تھی، کوئی بھی نہیں جاگا تھا اب تک۔ پتہ نہیں آج ناشتہ بنانے کی ذمہ داری کس نے اپنے سر لی تھی؟اور جس نے بھی لی تھی، وہ اٹھنے بھی والا تھا یا نہیں؟نوید کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔وہ بتا چکا تھا آج ناشتہ وہ نہیں بنائے گا، تو جو بھی ذمہ داری لے، یہ اُسکا دردِسر نہیں تھا۔

خاموش راہداری سے گزرتے وہ راستے میں آتی تمام بتیاں بجھاتا چلا گیا کہ فجر ہو چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں روشنی ہو جاتی۔یہی عمل اُس نے نیچے ہال میں بھی دہرایا۔پھر باورچی خانے کے پیچھے والا دروازہ کھول کر باہر باغیچے میں آگیا۔باغیچے میں بنے ٹریک پر کھڑے ہو کر اُس نے پہلے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کی اسٹاپ واچ آن کی اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔اب جب تک پچاس منٹ پورے نہیں ہو جاتے وہ رکنے نہیں والا تھا۔

دوسری جانب علی بھی ٹھیک چھ بجے اُٹھ کر کچن میں پہنچ چکا تھا۔کل دوپہر میں ہی اُس نے ناشتہ بنانے کی ذمّے داری اپنے سر لی تھی، بدلے میں کھانا بنانے کی ذمّے داری اُس نے رضا کے سر ڈال دی تھی، اُسکی مرضی کے بغیر!

نوید حویلی کے تین چکر لگانے کے بعد رکا تو پچاس منٹ پورے ہو چکے تھے۔اُس نے ایک نظر حویلی پر ڈالی اور لوہے کے دروازے کو کھولتا باہر بنی پکی سڑک پر آ گیا۔کچھ دیر وہ اکیلے رہنا چاہتا تھا۔

ٹخنوں سے اوپر آتے سیاہ ٹراؤزر پر سفید زیپر ہڈی پہنے وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیدھا چلتا کھائی کے پاس پہنچا،اور کنارے رکھے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔نیلے آسمان پر صبح کے سورج کی کرنیں پھیلنے لگی تھی،اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سورج کی پہلی کرن میں الگ سے چمک رہی تھیں۔منظر خوبصورت تھا،اُس نے گہری سانس لیکر فضا میں موجود ٹھنڈک اپنے اندر اُتاری۔ پھر ہڈی کی جیب میں موجود دایاں ہاتھ باہر نکالا،تو ساتھ میں وہ شے بھی باہر آ گئی جسے وہ ہمیشہ ساتھ لیے گھومتا تھا۔اُس نے سنجیدہ نظروں سے ہتھیلی پر موجود اُس ڈائل کو دیکھا۔

وہ گھڑی کا ڈائل۔۔۔۔

کلائی میں باندھنے والی گھڑی کا جلا ہوا ڈائل۔۔۔۔

جسے اُسکا بیٹا معید بہت پسند کرتا تھا۔جب بھی نوید کے ہاتھ میں دیکھتا،اُس سے زبردستی اتروالیتا اور پھر اُسکے ساتھ کھیلتا رہتا۔جس روز وہ جل کر مرا تھا،اُس روز بھی نوید نے اُسے اپنی گھڑی اُتار کر دے دی تھی تاکہ وہ اُس سے کھیلتا رہے۔

نوید نے انگوٹھے کی پور سے گھڑی کے ڈائل کو چھو کر دیکھا۔بایاں ہاتھ اب بھی جیب میں تھا۔اُسکے جلے ہوئے آفس میں اس گھڑی کا ٹوٹا پھوٹا ڈائل ہی بچا تھا۔اُسکی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے،اس باراُس نے روکا نہیں اور ایک قطرہ بند توڑ کر گالوں پر پھسل گیا۔پر اُسکی محویت میں کوئی کمی نہ آئی۔

یہ کسٹمائز گھڑی اُسے بشریٰ نے تحفے میں دی تھی۔جب بشریٰ نے نوید کے کہنے پر جاب شروع کی تھی،اور جب وہ اپنی کوتاہیوں کا احساس کر کے اُسکا خیال رکھنے لگا تھا۔تب اُس نے اپنی تنخواہ جمع کر کے اُسکے لیے یہ مہنگی گھڑی خریدی تھی۔نوید کو ان گھڑیوں،یا کف لنکس وغیرہ کا کوئی شوق نہ تھا،پر بشریٰ اُسکے لیے ہمیشہ تحفتاً یہی سب خریدتی تھی اور اُسکے لیے وہ پہن بھی لیا کرتا تھا۔

اُس نے گالوں پر آئی نمی کو آستینوں سے صاف کیا،اور ایک مرتبہ پھر ڈائل کو سامنے کر کے دیکھا۔اس بار بشریٰ یاد آئی۔دل کچھ مزید دکھا۔پتہ نہیں کیا کر رہی ہو گی اِس وقت؟اب کہ اُس نے ڈائل واپس جیب میں رکھا اور دوسرا ہاتھ باہر نکالا تو اُس میں موبائل تھا۔فون کا

وائی فائی آن کیا اور واٹس ایپ کھولا۔ رات کو وہ اسے اپنا حال احوال بتا کر، شب بخیر کہہ کر سو گئی تھی تو دوبارہ میسیج نہیں کیا تھا۔ اُس نے موبائل سامنے کیا اور دونوں ہاتھوں سے پیغام لکھنے لگا۔

''کیسی ہو؟ جاگ رہی ہو؟''اُس نے پیغام بھیجا، دوسری جانب سے چند سیکنڈ میں ہی دیکھ لیا گیا۔

''ہاں! نماز پڑھ کر سونے لیٹی تھی، پر نیند نہیں آ رہی تو جاگ رہی ہوں۔ تم کیسے ہو؟ ناشتہ کیا؟''اُس نے پوچھا تو نوید مسکرایا۔

''نہیں! اب کروں گا، پھر ڈیوٹی پر جانا ہے۔ دوبارہ بات نہیں ہو سکے گی اس لیے ابھی میسیج کر دیا۔''اُس نے وہی جھوٹ بولا جو پچھلے ایک ہفتے سے بولتا آ رہا تھا، اور جو آگے پورا مہینہ بولنا تھا۔

''میں نے تو سینڈوچ کھا لیا!''اُس نے مسکراتا ہوا ایموجی بھیجا تو نوید کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے کی کیفیت کا اثر زائل ہونے لگا۔ اُس سے چند منٹ مزید بات کرنے کے بعد اسے سونے کی تلقین کرتا وہ کھڑا ہوا۔ موبائل کا انٹرنیٹ بند کر کے، اُس نے چہرہ واپس ویسا ہی کر لیا، سخت اور سپاٹ۔ ہر احساس سے عاری۔۔۔ پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے واپس حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

--------+---------+----------

''تمہیں ایک آملیٹ بنانا بھی نہیں آتا؟ کیا تیر مارا ہے تم نے اتنے سال؟ سوائے رنگوں سے کھیلنے کے؟''کاؤنٹر پر دونوں بازو ٹکائے مقدّم نے علی کو عجیب و غریب طریقے سے پیاز کاٹتا دیکھ کر لتاڑا تھا۔

''اتنا برا لگ رہا ہے تو آ کر خود کاٹ لو۔''اُس نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔ ایک تو اُسکی آنکھیں جل رہی تھیں، اوپر سے اِسکے نخرے ختم نہیں ہو رہے۔

''کیوں؟ تمہارا کام ہے خود کرو!''وہ صاف ہری جھنڈی دکھا گیا۔

''تو پھر چپ کر کے کھڑے رہو۔''اُس کا صبر بھی جواب دے رہا تھا۔

''لاؤ میں کاٹ دوں۔''عمر کے اندر کی ہمدردی جاگ اٹھی۔

''اسکو لیکر جاؤ یہاں سے۔'' مقدّم نے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے رضا کے حوالے کیا اور رضا نے بھی سچ مچ اُسے پاس رکھی کرسی پر زبردستی بٹھا دیا۔

''اب دیکھو! میں کروں کسی کی بھی مدد سبزیاں کاٹنے میں۔'' اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا۔

کچن اس وقت مصروف تھا، علی صبح چھے بجے اٹھ گیا تھا اور اُس نے پوری تسلی کی تھی کہ وہ اکیلا نہ اٹھے بلکہ اتنا شور تو ضرور مچائے کہ ساتھ والے بستر پر سویا رضا نا چاہتے ہوئے بھی اٹھ بیٹھے۔ اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ وہ ہر بار کمرے کی کوئی شے نیچے گرا دیتا پھر رضا کا سڑا ہوا منہ دیکھ کر کہتا ''اوہ! سوری! میں نے جان کر نہیں کیا۔'' پھر باتھروم کا دروازہ زور سے بند کرتا، پھر الماری کا پٹ بھی، پھر لائٹ جلا دیتا یا پاؤں زور زور سے پٹخ کر چلتا اور یہی جملہ دہراتا رہتا، یہاں تک کہ رضا تنگ آ کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ اُٹھا تو اُس نے علی کو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی، اور وہ بھی کیوں کر اپنی غلطی مانتا؟ اُس سے دوبدو بحث میں اُلجھ گیا، یہاں تک کہ تین کمروں کے فاصلے پر موجود عمر جو راہداری میں کسی کام سے آیا تھا وہ بھی وہاں آ گیا، اور پھر مقدّم بھی اٹھ ہی گیا۔ اُن تینوں کی نیند برباد کرنے کے بعد وہ سکون سے کچن میں آ گیا تا کہ ناشتہ بنا سکے، پر کچھ ہی دیر میں باقی چاروں بھی باورچی خانے میں اُسکا ضبط آزمانے پہنچ چکے تھے۔ حسین کو بھی رضا اپنے ساتھ لے آیا تھا، اُسکی طبیعت کچھ عجیب سی تھی، لہٰذا وہ خاموش سا ایک کنارے بیٹھ گیا۔ اُسکا خاموش ہونا سب ہی نوٹ کر رہے تھے، پر فلحال کسی نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا۔

''جلدی ناشتہ بناؤ! اُسکے بعد رضا کو کھانا بھی بنانا ہے، پھر گیس چلی جاتی ہے۔'' مقدّم نے ایک مرتبہ پھر لتاڑا تو عمر کے سر پر کھڑے، اُسکی پہریداری کرتے اور علی کی حالت سے حظ اٹھاتے رضا کی مسکراہٹ سمٹی۔

''کھچڑی بناؤ گا بیٹا میں!'' اُس نے جتایا۔

''جو بھی بناؤ! بنانا تو تمہیں ہی ہے۔'' مقدّم نے بھی چڑایا۔

''تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟'' عمر نے اُنکی بے مقصد گفتگو سے تنگ آ کر خاموش بیٹھے حسین کو مخاطب کیا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اُس نے کچھ بیزار سے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کل صبح تک تو ٹھیک ٹھاک تھے۔'' اب کہ مقدم کا رخ اُسکی جانب ہوا۔

''صبح ٹھیک ہونے کا، ابھی ٹھیک نہ ہونے سے کیا تعلق ہے؟''اُس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ اتنا سنجیدہ تو وہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ مقدم کوئی جواب دیتا باورچی خانے کے دروازے پر کوئی آ کر رکا، سب کی گردنیں ایک ساتھ مڑیں۔ وہاں نوید اپنی ہڈی کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کچھ حیران سا کھڑا اُن سب کو دیکھ رہا تھا۔

''تم لوگ سب یہاں کیا کر رہے ہو؟''اُس نے اپنی حیرت کو زبان دی۔ اصل مسئلہ یہی تھا کہ وہ ''سب'' یہاں کیا کر رہے تھے؟

''علی کی مدد کر رہے تھے۔''رضا کے بیساختہ جواب پر جہاں مقدّم اور عمر ہنسے تھے، وہیں علی نے منہ کھول کر اور آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''سب ایک ساتھ مدد کر رہے تھے؟''اُس نے آبرو اُچکا کر ذرا مزید حیرت سے اُن سب کو دیکھا، جن کو دیکھ کر واضح نظر آ رہا تھا کہ سب کیا شغل فرما رہے ہیں۔

''اب اس بات پر بھی جواب طلبی ہو گی؟''یہ طنزیہ جملہ حسین کی جانب سے آیا تھا۔ سب نے کچھ حیرت سے اُسے دیکھا سوائے نوید کے۔ اُسکا چہرہ اس بات پر سنجیدہ ہوا تھا۔

''میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔''اُس نے ضبط کے ساتھ سنجیدہ لہجے میں وضاحت دی۔ شاید پہلی بار!

''آپ لوگوں کو کوئی مدد درکار ہے؟''اچانک ہی نوید کے پیچھے سے اکرم نمودار ہوا۔

''ارے! تم اتنی جلدی کیوں آ گئے؟''علی نے معصومیت کی انتہا کرتے ہوئے کہا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔

''میں آتا ہوں فریش ہو کر۔''نوید سنجیدگی سے کہتا وہاں سے چلا گیا۔

''یہ کہاں تھا اتنی دیر سے؟''اُسکے جانے کے بعد مقدّم نے ذرا مشکوک سے انداز میں پوچھا۔

''صبح سے حویلی کے تین چکر کاٹنے کے بعد کہیں باہر گیا تھا۔ میں نے یہاں لان کے دروازے سے دیکھا تھا اُسے۔''علی نے بتایا۔

''چکر کاٹنے سے مراد؟''عمر سمجھا نہیں۔

''مراد جاگنگ کر رہا تھا، اور تم آہی گئے ہوئے تو یہ پیاز ہی کاٹ دو۔'' علی نے پہلے عمر اور پھر اُسکے پیچھے کھڑے اکرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اکرم سر ہلاتے کاؤنٹر کے پاس آیا اور اُس سے پیاز لے لیں، جسکا وہ بیڑا غرق کر چکا تھا۔

''اور اُسکے بعد وہ حویلی سے باہر گیا تھا؟'' حسین کی سوئی تو بس یہیں آ کر اٹکی تھی۔

''ہاں!'' علی نے جواب دیا۔

''کہاں؟''

''مجھے بتا کر نہیں گیا تھا۔'' اُس نے چڑ کر کہا۔

''ہاں! وہ تھوڑی ہمیں بتانے کا پابند ہے، ہم ہی قید ہیں یہاں!'' حسین کا لہجہ ایک بار پھر تلخ ہوا۔

''تمہیں آخر برا کیا لگا ہے؟ اُسکا بتا کر نہیں جانا یا تم سے سوال کرنا؟'' رضا نے بالآخر اُس سے براہِ راست سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں!'' وہ کرسی گھسیٹتا کھڑا ہوا اور ڈائننگ ہال میں جا کر کرسی نکال کر اُس پر ڈھیر ہو گیا۔

''اسکو ہوا کیا ہے؟'' عمر پریشان ہوا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید!'' مقدّم نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا ہے اُسے، ٹھیک ہے وہ!'' یہ جواب رضا نے دیا تھا۔

''کیا مطلب اِس بات کا؟'' علی نے بھنویں چڑھا کر پوچھا۔ وہ بیمار تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوا اُسے۔

''مطلب یہ کہ تم اُس پر توجہ دینے کے بجائے جلدی ناشتہ بناؤ! مجھے کھانا بنانے کے لیے کچن خالی چاہیے۔'' اُسے تپاتا ہوا وہ بھی ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ علی بس گھور کر رہ گیا تھا اُسے۔

--------+---------+----------

اُس روز رضا نے واقعی کھچڑی بنائی تھی، جسے سب نے صبر و شکر سے کھا تو لیا پر بعد میں مقدّم نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کہا کہ آئندہ کھانا نہ بنائے۔ وہ بھی ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔ کھانے کے بعد علی اپنے وعدے کے مطابق عمر کے ساتھ لائبریری میں چلا آیا۔ ہال میں موجود دائرے کی صورت اوپر اٹھتی دونوں سیڑھیوں کے برابر میں نیچے دو دروازے تھے، ایک تو دائیں طرف والی سیڑھیوں سے منسلک تھا، جسکے آگے راہداری، باورچی خانہ اور ڈائننگ حال تھا۔ بائیں طرف والی سیڑھی سے بھی بالکل ایسا ہی ایک دروازہ منسلک تھا۔ اُس دروازے سے بھی ایک لمبی راہداری جارہی تھی، جو اس گھر کی باقی راہداریوں کی طرح ہی طویل، خاموش اور سجاوٹ سے بھرپور تھی۔ اُس کے اختتام پر ایک اور ہال تھا، اور یہ ہال باہر والے ہال سے چار گنا بڑا تھا۔ یہاں پر کئی دروازے تھے، ہر دروازے کے پیچھے کوئی نہ کوئی کمرہ تھا، یا مزید کوئی راہداری جو آگے کے حصوں کو حویلی سے جوڑ رہی تھی۔ ہال کی چھت محرابی تھی، درمیان میں کھڑے ہو تو پہلی منزل پر دائرے کی صورت پوری ریلنگ تھی، جس سے پہلی منزل پر موجود مزید دروازے اور راہداریاں نظر آرہی تھیں۔ غالباً اِس حویلی کو اسطرح سے بنایا گیا تھا کہ پہلی منزل پر کھڑے ہو کر پورا ہال نظر آجائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے تھے کہ اصل حویلی تو یہاں ہے، وہ تو شروعات تھی۔'' دوسرے ہال میں کھڑے علی نے عمر کو کہا تھا۔

''ہاں نا! اگر تم صرف حویلی ہی گھومنے نکلو تو اچھا وقت گزار سکتے ہو یہاں۔ خیر! میں نے تمہارے لیے تمہارے مطلب کی جگہ ڈھونڈی ہے۔'' عمر اُسے ہال کے ایک دروازے کی طرف لایا اور اُسے کھول دیا۔ علی اُسکے پیچھے اندر آیا تو اُسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بلند و بالا محرابی چھتیں پتھر کے مضبوط ستونوں پر ٹکی ہوئی تھیں، چاروں طرف دیواروں کے ساتھ فلک بوس الماریاں بنی ہوئی تھیں، جن میں کتابیں نہایت ترتیب سے رکھی گئی تھیں۔ چھ فٹ سے اوپر کے شیلف کو الگ منزل بنا دیا گیا تھا۔ جنکے آگے بنی، لکڑی کی بالکونی نما گزرگاہیں، اوپر کی سطحوں کو آپس میں جوڑ رہی تھیں۔ اوپر تک پہنچنے کے لیے ایک نفیس گھومتی ہوئی سیڑھی نصب تھی۔

کمرے کے وسط میں لمبی لکڑی کی کافی ساری میزیں رکھی تھیں، جن پر چھوٹے چھوٹے لیمپ نصب تھے۔ لیمپ کی مدھم سنہری روشنی ماحول کو پراسرار اور دلکش بنا رہی تھی۔

اور اس وسیع و عریض کتب خانے کی سب سے منفرد بات اس کی ترتیب تھی، ہر علم، ہر موضوع، اپنے الگ حصے میں واضح طور پر مرتب تھا۔ ایک طرف ناولوں کا سیکشن تھا، تو دوسری جانب سفرناموں کی قطاریں تھیں، ایک گوشے میں ہارر کتابیں رکھی تھی، تو دوسرا

ڈاکیومنٹری اور تاریخ کا حصہ تھا۔ ایک علیحدہ حصہ پولیٹکس کے لیے تھا، قریب ہی ایجوکیشن اور سائنسی علوم کا سیکشن بھی تھا، جن میں سائنس فکشن، ارضیات، حیاتیات، فلکیات اور دیگر مضامین اپنی اپنی جگہ سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تسلسل میں ایک گوشہ مارکیٹنگ اور اکاؤنٹس جیسے عملی علوم کے لیے مخصوص تھا، جبکہ ایک نہایت نفیس اور فنکارانہ حصّہ آرٹ کے لیے تھا، جو انٹیریئر آرٹ، اسلامک آرٹ اور خطاطی (کیلیگرافی) کی کتابوں سے مزین تھا۔ علی کی نگاہوں کا مرکز بھی یہی حصّہ بنا تھا۔

''مقدّم نے اِس حویلی کو ہوگوارٹس کا نام دیا تھا۔'' کیلیگرافی کی کتابیں نکالتے اُسکے کانوں سے عمر کی آواز ٹکرائی تو وہ مسکرایا۔

''صحیح نام دیا ہے اُس نے۔'' وہ کتاب کھولتے ہوئے ہنسا۔

ہر شیلف کے اوپر واضح اور خوبصورت انداز میں اُس حصّے کا نام درج تھا۔ عمر اور علی کو تو آرٹ پر ایسی ایسی کتابیں مل گئی تھیں، جن کے بارے میں اُنہوں نے صرف سنا تھا۔ حویلی کے مالک کا شوق بہترین تھا۔

''میرا اچھا وقت گزرے گا یہاں!'' علی نے کہا۔

''اس لیے تو میں تمہیں یہاں لایا تھا۔'' عمر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ واقعی اُس جگہ پر پورا دن بنا بیزاری کے گزار سکتا تھا۔

--------+---------+----------

دو تین روز لگے اُنہیں وہاں ایڈجسٹ ہونے میں۔ پر آہستہ آہستہ وہ اس ماحول سے ہم آہنگ ہونے لگے۔ اُنکو وہاں پانچواں روز تھا، حسین پچھلے چار دن سے مسلسل کمرے میں بند تھا، بہت زیادہ ہوتا تو ناشتے یا کھانے کی میز پر آجاتا، بعض دفعہ وہ بھی نہ کھاتا، انکار کر دیتا۔ آج بھی نوید صبح اٹھا تو حسین عجیب بے دم سا پڑا تھا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' نوید نے قریب آکر پوچھا۔

''ٹھیک ہوں میں!'' وہی بیزار سا جواب۔

''تم ناشتے پر نہیں آئے آج پھر، کم از کم کھانے پر تو چلو میرے ساتھ۔۔۔کمرے سے باہر نکلو! باہر باغیچے میں چہل قدمی کرو۔اس طرح بند پڑے رہو گے تو طبیعت اور خراب ہو گی۔'' پچھلے پانچ ماہ میں شاید پہلی دفعہ نوید نے اُس سے اتنی نرمی سے بات کی تھی۔انداز فکر مند سا تھا۔

''تم ہی تو چاہتے ہو کہ ہم یہاں بند رہیں۔'' وہ پتہ نہیں اتنا تلخ کیوں ہو رہا تھا؟

''اپنے لیے کوئی ایکٹیویٹی ڈھونڈو! باقی سب بھی تو کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔''نوید کے لہجے کی نرمی میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تم جاؤ! میرا دل کرے گا تو میں آجاؤں گا۔''اُس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔نوید نے ہاتھ بڑھا کر اُسکے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ماتھا انگارہ ہو رہا تھا۔

''تمہیں بخار بھی ہے، میں کل سے کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر کے پاس چلو! یا میں یہیں بلوا لیتا ہوں۔'' وہ فکر مند ہوا۔

''نوید! میری فکر چھوڑ دو۔اور جا کر اپنا کام کرو۔'' وہ اپنے لہجے میں آیا غصّہ چھپا نہ سکا۔نوید اثبات میں سر ہلاتے پیچھے ہٹا۔

''ٹھیک ہے! تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔حسین اسی طرح لیٹا رہا۔آج کل وہ بہت زیادہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔کسی سے بات کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

نوید نیچے آیا تو وہ سارے ہال میں موجود، دوپہر کے کھانے پر حسین کے منتظر تھے۔پچھلے تین چار روز سے وہ لوگ کوشش کر کے تھک چکے تھے، پر حسین کو نہیں آنا ہوتا تو وہ نہ آتا۔نوید سنجیدہ چہرے کے ساتھ دائیں طرف والی سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور عمر کے پاس آیا۔

''حسین کو بخار ہے۔رات کو بھی تھا، میں دو روز سے کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر کے پاس چلو، پر وہ راضی ہی نہیں ہے۔''نوید نے پریشانی کا اظہار کیا۔

''ہو سکتا ہے کہ یہاں کا موسم راس نہ آرہا ہو اُسے؟'' عمر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا اُسے، ٹھیک ہے وہ!'' رضا نے ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا تو سب ہی نے ناگواری سے اُسے دیکھا تھا۔

''اُسکی طبیعت اتنی خراب ہے اور تم دو روز سے یہی راگ الاپ رہے ہو کہ کچھ نہیں ہوا اُسے۔'' علی کو برا لگا تھا۔

"میری بات سنو! عام آدمی ہے وہ، ایک ہیلدی لائف (صحتمند زندگی) گزارنے والا عام آدمی! اُس نے زندگی میں نہ اتنے مسائل دیکھے ہیں، نہ ہی اتنی پریشانیاں جتنی تم لوگ دیکھ کر آرہے ہو۔ نہ ہی وہ اپنے گھر والوں سے اتنا لمبا دور رہا ہے۔ ایک ہفتے سے اوپر ہو چکا ہے، وہ اپنے گھر والوں سے میسیج پر بھی بات نہیں کر سکا تو ظاہر ہے، اُسکا چڑچڑا ہونا بنتا ہے۔ اِسکے برعکس اگر وہ اپنی فیملی سے ایک آدھ بار بھی بات کر لیتا تو بہتر ہوتا۔ ہوم سک ہو رہا ہے وہ بس!" رضا نے اپنی بات کی وضاحت دی، اُس کی بات درست تھی۔ حسین کا چڑچڑا پن دراصل اُسکے گھر والوں سے دوری کی وجہ سے ہی تھا۔

"فرّخ صاحب سے بات کی ہے میں نے، کہہ رہے تھے کہ ایک دو روز میں مزید کوئی مشکوک سرگرمی نظر نہ آئی تو وہ انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دے دیں گے۔" نوید نے بتایا۔

"تب تک کیا کریں؟" علی نے پریشانی سے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے؟ ہم سب باریاں لگا کر کھانا بنا چکے ہیں اور وہ پانچ دن سے بیماری کے نام پر کمرے میں بند ہے۔ میرے حوالے کر دو، کل اُسی سے ناشتہ بنواؤں گا۔ دو گھنٹے میں دماغ و طبیعت دونوں درست ہو جائے گی اُسکی۔" صوفے پر آلتی پالتی مارے براجمان رضا نے مشورہ دیا تو نوید نے بھنویں سکیڑ کر ناگواری سے اُسے دیکھا۔

"اُسے تین روز سے بخار ہے، تم اُس سے ناشتہ بنوانے کی بات کر رہے ہو؟" اُس نے کہا۔

"اے تم نا! اپنے آپ کو ہمارا باپ دادا، چچا سمجھنا بند کرو، تم ہمارے والدین ہو نہ ہم تمہاری اولادیں۔ جا کر اپنا کام کرو، ہم کر لیں گے جو کرنا ہے۔" رضا سے پہلے ہی مقدّم نے ٹھیک ٹھاک بیزار کن لہجے میں نوید کو جواب دیا تو وہاں کھڑے ہر شخص نے ذرا آنکھیں وا کر کے اُسے دیکھا۔ باقی سب تو کافی حد تک نارمل ہونے لگے تھے، پر نوید سے بات کرنے میں وہ اب بھی تھوڑا لحاظ رکھ رہے تھے، پر مقدّم نے اس لمحے تمام لحاظ بلائے طاق رکھ دیئے تھے۔ کونسا ایس ایس پی؟ کہاں کا ایس ایس پی؟

"جو کرنا ہے کرو!" نوید نے سنجیدگی سے کہا اور دائیں طرف والی راہداری کی طرف مڑ گیا۔

"ظاہر ہے وہی کریں گے۔" اُس نے بھی پیچھے با آواز بلند کہا پر نوید بنا کوئی جواب دیے راہداری میں گم ہو گیا۔

''اِس آدمی کو ایسی دو چار ڈوز روزانہ صبح و شام دیا کرو۔ یقین مانو! اِسکو اشد ضرورت ہے اسکی۔'' علی نے اُسکے عمل کو لائق تحسین سمجھتے ہوئے داد دی تو وہ ہنسا۔

''میں اکیلا کیوں؟ تم سارے مل کر دو تو کچھ بات بنے۔ یادداشت کمزور ہو گئی ہے اِسکی، بھول گیا ہے کہ ہمارے ساتھ ہی پڑھ لکھ کر بڑا ہوا ہے۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''ہاں! کتنی بار تو میں نے اِسے پک اینڈ ڈراپ سروس دی ہے، بائیک نہیں تھی اِسکے پاس۔ اور دیکھو اِس احسان فراموش کو!'' رضا نے کہا۔

''کتنی بار پک اینڈ ڈراپ دیا ہے تم نے اُسے؟ بمشکل دو سے تین بار؟ میں تو چھے سال بنا چوں چراں یہ فریضہ انجام دیتا رہا ہوں۔ پر مجھے اُس نے جانتے ہو کیا کہا؟'' علی نے پہلے رضا کو پھر باقی دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا؟'' عمر نے پوچھا۔

''جب ضرورت تھی، تب نہیں کہا تم سے تو اب کیوں کہوں گا؟'' علی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اور یہ اُس نے تمہیں کس بات کے جواب میں کہا؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''میں نے کہا تھا کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ سکتے ہو۔'' اُس نے بتایا۔

''تمہارے ساتھ تو اُس نے بالکل صحیح کیا۔'' یہ تبصرہ رضا کی جانب سے آیا تھا۔

''کیا تم سے کسی نے رائے مانگی؟'' علی حسب توقع تپا تھا۔

''چپ کرو یار تم دونوں! ابھی اِس آدمی کے بارے میں بتاؤ، جسے ہم اتنے سال پک اینڈ ڈراپ دیتے رہے ہیں اور یہ ایس ایس پی بن کر ہمیں ہی آنکھیں دکھا رہا ہے۔'' مقدّم نے ٹوکا۔

''اُسکی نوکری نے اُسے ایسا بنا دیا ہے۔ تم لوگ فضول میں اتنا ڈرنے لگے ہو اُس سے، دوست ہی تو تھا یہ ہمارا۔'' عمر نے کہا۔

''تم لوگ کون؟ میں تو بالکل نہیں ڈرتا اُس سے۔'' رضا نے کروفر سے کہا۔

’’میں بھی!‘‘ مقدم ہمنوا ہوا۔

’’تم لوگ کھانا نہیں کھاؤ گے؟‘‘ اِس آواز پر سب نے اچھل کر دائیں طرف والی سیڑھیوں کی جانب دیکھا، جسکے برابر دروازے پر نوید کھڑا تھا۔ سب کی سانسیں رکی، اُس نے سن تو نہیں لیا کہیں؟

’’ہم بس! آ ہی رہے تھے۔‘‘ عمر نے گڑ بڑاتے ہوئے وضاحت دی۔

’’تو جلدی آؤ! میں انتظار کر رہا ہوں۔‘‘ اُس نے سنجیدگی سے کہتے اُنہیں حیرت میں ڈالا۔ وہ کب سے کسی کا انتظار کرنے لگا؟ اُن پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتا نوید جانے کے لیے مڑا، اُنہوں نے رکا سانس بحال کیا۔ وہ رکا، پھر پلٹ کر دوبارہ اُنہیں دیکھا۔

’’میں اکثر پیٹرول بھروادیا کرتا تھا۔‘‘ سنجیدگی سے کہتا نوید ایک بار پھر راہداری میں گم ہو گیا۔ سب کا منہ ہکا بکا رہ گئے۔

’’یہ۔۔۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کبھی اِس سے پک اینڈ ڈراپ کے لیے پیٹرول نہیں لیا۔ سراسر جھوٹ!‘‘ مقدّم نے سب سے پہلے وضاحت دی۔

’’میں نے بھی!‘‘ عمر نے بھی کہا۔

’’جیسا کہ علی نے بتایا کہ میں نے گنتی کے دو تین بار ہی اُسے یہ سروس دی ہے، تو میں نے تو کبھی مر کر بھی ایسا نہیں سوچا۔‘‘ رضا نے بھی کہا۔ اب کہ تینوں نے ایک ساتھ علی کی جانب دیکھا۔

’’خدا کی قسم! ایک بار کے علاوہ کبھی پیٹرول نہیں ڈلوایا، اُس نے میری بائیک میں۔‘‘ علی گڑ بڑایا۔

’’تو تم نے ایک بار بھی ایسا کیوں کیا؟‘‘ مقدم کا انداز لتاڑتا ہوا تھا۔

’’ایک بار وہ میری بائیک اُدھار لیکر گیا تھا اور اُس نے خود ہی پیٹرول ڈلوادیا تھا۔ دوسری مرتبہ ہم دونوں کو ہائی وے ٹول پلازہ کے پار جانا تھا، تو ہم باری باری بائیک چلا رہے تھے، اپنی باری میں اُس نے مجھ سے پوچھے بنا ہی پیٹرول ڈلوادیا تھا۔‘‘ اُنکی ملامتی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر اُس نے وضاحت دی۔

’’تم نے ابھی ایک مرتبہ کہا تھا۔‘‘ مقدّم چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔

''ہاں تو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا،اب سولہ سال پرانی باتیں ہو گئی ہیں یہ سب۔''

''بس دو ہی بار؟''رضا نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ایک مرتبہ میں نے پیٹرول پمپ پر اُس سے کھلے پیسے مانگے تھے کیونکہ میرے پاس ایک ہی نوٹ تھا۔ تو اُس نے وہ پیسے واپس نہیں لیے، میرے ہزار بار کہنے کے باوجود بھی۔''اُس نے کان کھجاتے کہا۔

''لعنت ہو تم پر!''مقدّم نے دل میں ہر گز نہیں رکھا۔

''میں نے کہانا! صحیح کرتا ہے وہ اِسکے ساتھ۔''رضا نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسا صرف دو تین بار ہی ہوا ہے اور وہ بھی اتفاقیہ! باقی میں نے اُس سے کبھی پیسے نہیں لیے۔ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟''علی نے بے بسی سے کہتے عمر کو دیکھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا،اُس نے اتفاقیہ ایک دو مرتبہ کے علاوہ کبھی نوید سے پیسے نہیں لیے تھی،پر وہ بد تمیز آدمی اُسکا کردار مشکوک کر کے چلا گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے، یہ لوگ صرف مذاق کر رہے ہیں۔''عمر نے تسلی دی۔

''ہمارا بھلا کوئی مذاق ہے؟''اب کہ وہ ناراض ہوا۔

''چلو! تم لوگ کھانے پر جاؤ، میں حسین کو لیکر آتا ہوں۔''رضا نے کہا۔

''ابھی تو نوید نے کہا کہ وہ نہیں آئیگا۔''عمر نے کہا۔

''اُسکے تو اچھے بھی آئیں گے۔''رضا نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ویسے تم لوگوں کو اس طرح نوید کی برائی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''عمر کو اچانک ہی یاد آیا کہ تھوڑی دیر قبل وہ لوگ کافی غیر اخلاقی حرکت کر رہے تھے۔

''برائی کب کی ہم نے؟ ہم تو اُسکی حقیقت بیان کر رہے تھے۔''رضا نے سیڑھیوں پر رک کر ڈھٹائی سے کہا۔

''آئندہ میں ایسی کسی زنانہ محفل کا حصّہ نہیں بنوں گا۔'' عمر نے خفگی سے کہا۔

''زنانہ؟''

''یہ گوسپ عورتوں کا ہی کام ہے۔'' اُس نے جتایا تھا پر وہاں فرق کسے پڑ رہا تھا؟

--------+---------+----------

اُسکی طبیعت ابھی ابھی ہی کچھ بہتر لگنے لگی تھی، جسم کو کچھ آرام آیا تو نیند آنے لگی۔ ابھی وہ نیم غنودگی میں ہی تھا کہ کسی نے اُسکے بازو پر دستک دی۔ اُس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے رضا کا چہرہ نظر آیا۔

''کیا ہے؟'' حسین نے بیزاری سے کہا۔

''دوپہر کے ڈیڑھ بج رہے ہیں، سونے کا نہیں کھانے کا وقت ہے یہ۔ اٹھو! نیچے چلو میرے ساتھ!'' اُس نے حسین کو زبردستی اٹھانے کی کوشش کی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے، جب لگے گی تو کھالوں گا۔'' اُس نے کوفت سے کہتے لحاف منہ پر ڈالنا چاہا پر اگلے ہی لمحے کسی نے اُسکا لحاف کھینچ لیا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' وہ جھنجھلایا، اب کہ سامنے مقدم کھڑا نظر آیا، رضا اُسکے پیچھے۔

''بعد میں کھانا ختم ہو جائیگا، ایس ایس پی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے کڑھی بنائی ہے۔'' مقدم نے کہا تو اُس نے گھورا۔

''ہاں! اور تمہارے انتظار میں اب تک کھانا بھی نہیں کھایا اُس نے۔'' اِس تیسری آواز پر حسین نے گردن اٹھا کر دیکھا تو میز سے ٹیک لگائے کھڑا علی بھی نظر آیا۔

''شٹ اپ!'' اُس نے چڑے ہوئے انداز میں کہا اور اُٹھ بیٹھا۔ تینوں مسکرائے۔

''کہا تو ہے کہ بھوک نہیں ہے۔'' اُسے اپنے لہجے کا احساس ہوا تو ذرا خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہم تو نہیں جا رہے تمہارے بغیر!'' رضا نے حتمی انداز میں کہا۔

''جانے دو یار! میرے خیال سے اُسکی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔''اس چوتھی آواز پر حسین سمیت سب نے مڑ کر دیکھا تو دروازے پر عمر کھڑا نظر آیا۔ وہ نوید کو بتانے گیا تھا کہ ہم حسین کو لیکر آرہے ہیں، وہ چاہے تو انتظار کرلے چاہے تو کھانا کھالے، اور اب دروازے پر موجود تھا۔

''نیچے ایک آدمی کو بتایا ہے ناابھی، کہ خود کو ہمارا باپ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہیں بھی وہی کہوں؟''مقدّم نے اُسے آنکھیں دکھاتے کہا تو وہ بس گہری سانس لیکر رہ گیا۔

''نیچے کس کو بتایا؟''حسین کی دلچسپی اچانک ہی بیدار ہوئی۔ وہ چاروں صرف اُسے کھانے پر بلانے کے لیے آئے تھے، فقط اتنی سی بات سے ہی اُسکی بیزاری یکلخت ہی غائب ہونے لگی تھی۔

''نوید کو!۔۔۔''مقدم کہتے ہوئے پلنگ پر اُسکے سامنے بیٹھا۔''اُسکو میں نیچے بتا کر آیا ہوں کہ ہم تمہاری اولادیں نہیں ہیں اور نہ تم ہمارے باپ، اِس لیے انسان بن کر رہو، اور اپنے کام سے کام رکھو۔''اُس نے مزے سے بتایا۔

''کیا واقعی تم نے ایسا کہا؟''حسین کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

''اور ساتھ میں اُسکی برائیاں کرتے ہوئے پکڑے بھی گئے ہو، یہ بھی بتاؤ۔''عمر نے جتایا۔

''برائی نہیں کررہے تھے ہم۔''رضا نے ٹوکا۔

''اور اُس نے واقعی سن لیا؟''حسین کی دلچسپی بڑھی۔

''ہاں! اور ان لوگوں کی ہوا بھی نکل گئی تھی، اُسے سامنے دیکھ کر۔''علی نے طنزیہ کہا۔

''اور اُس نے جو اباؤ لیل بھی آپ ہی کو کیا تھا۔''رضا نے تپانے والی مُسکراہٹ کے ساتھ اُسے جواب دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں آپس میں دوبارہ اُلجھ پڑتے عمر فوراً بولا کہ

''اچھا اب جلدی نیچے آؤ! کھانا ٹھنڈا ہو جائیگا۔''

''میں منہ دھو کر آتا ہوں۔''حسین بالآخر لحاف پرے کرتا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

نیچے کھانے کی میز پر پہنچے تو نوید سفید ٹراؤزر پر سفید زیپر ہائی نیک پہنے، دونوں بازو سینے پر باندھے بے تاثر چہرے کے ساتھ آج ایک بار پھر سے سربراہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ البتہ آنکھیں براہِ راست اُن پانچوں کو گھور رہی تھیں۔ پہلے وہ اُنہیں بلا کر آیا تو وہ اُسکی غیبتوں میں لگ گئے، پھر دوبارہ بلا کر آیا تو وہ حسین کو بلانے چلے گئے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اُنکے انتظار میں یہاں وقت برباد کر رہا تھا۔ وہ بھی داد طلب ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے، اُسے نظرانداز کرتے، کھانے میں مشغول ہو چکے تھے۔ البتہ نوید اب تک لب بھینچے اُنہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''یہ اِس طرح کیوں گھور رہا ہے ہمیں؟'' علی نے پوچھا۔ وہ پانچوں آمنے سامنے، نوید سے اتنا فاصلہ ضرور رکھ کر بیٹھے تھے کہ اُنکی سرگوشیاں اُس تک نہ پہنچے۔

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے اُس سے؟'' رضا کیوں موقع گنواتا؟

''ہرگز نہیں!'' اُس نے چبا چبا کر کہا۔

''پر دیکھنے کے انداز سے تو ایسا لگ رہا ہے، جیسے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے۔'' مقدّم نے گفتگو میں حصّہ لیا۔

''یہ اُسکی برائی کرنے سے پہلے سوچنا تھا۔'' عمر نے کہا۔

''ہم نے حقیقت بیان کی تھی۔'' رضا نے ایک مرتبہ پھر تصحیح کی تو اب کہ عمر نے سرتاپاؤں اُسے گھوری سے نوازا۔

''ہاں بالکل! اگر تم نے اپنی لالچ میں آکر اُس سے پیٹرول کے پیسے نہ لیے ہوتے، تو آج یہ ہمیں ایسے نہ گھور رہا ہوتا۔'' مقدّم نے علی کو مخاطب کر کے کہا تو پانی پیتے اُسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ عمر نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''میں یہ قصہ سننا چاہوں گا۔'' حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کھانے کے بعد!'' مقدم نے وعدہ کیا تو علی نے کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اِسکی کسی بات پر کان مت دھرنا۔'' علی نے حسین کو کہا۔ وہ کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ نوید کرسی گھسیٹ کر اٹھا، سب کی نظریں بیساختہ اُسکی طرف گئیں۔ وہ اٹھا اور سنجیدگی سے علی کی طرف بڑھا۔ اُسکے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ لوگ اپنے ہاتھ،

سانسیں، آوازیں سب روک اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ علی کے پاس آکر رکا، پھر تھوڑا جھک کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ علی نے تھوک نگلا، اور پھر اُس نے میز پر رکھا کڑھی کا ڈونگا اٹھایا اور واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

اوہ! تو وہ اِس لیے انہیں گھور رہا تھا؟ اور اُن میں سے کسی نے زحمت بھی نہ کی کہ کھانا آگے بڑھا دیں۔ اب کہ وہاں غیر آرام دہ سی خاموشی چھا گئی۔ انگریزی میں جسے کہتے ہیں۔

Awkward silence

''جب میں نے تمہیں کھانے پر بلایا تو تم نے آنے سے منع کر دیا تھا۔'' پلیٹ میں موجود چاولوں پر کڑھی ڈالتے نوید نے براہِ راست حسین کو مخاطب کیا۔ وہی کڑھی جسکے پکوڑے اور گریوی اکرم نے بنائی تھی، پر نام ایس ایس پی صاحب کا ہوا تھا کہ انہوں نے فقط مدد کر دی تھی۔

''ہاں! کیا تو تھا۔'' حسین نے کندھے اچکاتے جواب دیا۔

''تو پھر اب کیوں آ گئے؟'' اُس نے ڈونگا واپس رکھتے بھنویں اچکا کر سوال کیا۔

''بلانے والوں کا فرق تھا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو نوید نے سر جھٹکا۔ وہ بولتا تو باقی سب خاموش ہو جاتے تھے۔

''یہاں فون بوسٹرز اتنے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے اکثر سم کے نیٹورکس نہیں آتے۔ فرّخ صاحب نے کہا ہے کہ کل سے تم لوگ اپنے گھر والوں سے بات چیت کر سکتے ہو۔ وائی فائی آن کر دیا جائیگا کل۔ کوشش کرنا کہ گھر والوں کے علاوہ اور کسی سے بات نہ ہو، اور نہ ہی اپنی لوکیشن کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا، تو باقی سب نے کوئی خاص ردعمل نہ دیا۔ نوید نے ذرا اچھنبے سے اُن سب کو دیکھا۔

''تم لوگ میری کسی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟'' یہ پہلی بار تھا، جب اُس نے جھنجھلا کر کوئی سوال کیا تھا۔

''تم بات کرتے ہی کب ہو؟'' یہ حیرت میں ڈوبا سوال علی کی جانب سے آیا تھا۔

''تو تمہارے خیال میں، میں ابھی اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا؟'' اُس نے ایک مرتبہ پھر سنجیدگی سے پوچھا۔

""تم نے بتایا اور ہم نے سن لیا، بھلا اس بات کا اور کیا جواب دیں اب؟"" مقدّم نے کہا۔ اب کہ نوید نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ سر جھٹک کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ باقی سب نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر مسکراہٹ چھپاتے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

----------+---------+--------

رات حسین کو دوبارہ ہلکا سا بخار آیا تو اُس نے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھا لیا، اس مرتبہ کسی نے بھی اُسکے ساتھ زبردستی نہ کی۔ البتہ اُسکی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ جب نوید اپنے معمول کے مطابق حویلی کا جائزہ لیکر واپس آیا تو حسین بستر پر نیم دراز اپنے موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھتے نوید نے ایک نظر میں ہی جان لیا کہ وہ اپنے موبائل میں اپنے بچوں کی تصاویر دیکھ رہا تھا۔ حسین نے اُسکے آنے کا اتنا کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔ نوید نے اپنی گھڑی اُتار کر دونوں بستروں کے درمیان والی میز پر رکھی اور براہِ راست اسکو دیکھا۔ وہ اُسکی نظریں خود پر محسوس کرتے ہوئے بھی انجان بنا رہا۔

""میں نے تمھیں اپنے دروازے سے واپس نہیں لوٹایا تھا حسین! میں اپنے کسی دوست کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔"" کمرے میں اُسکی آہستہ آواز گونجی تو موبائل پر تصویریں آگے بڑھاتی حسین کی انگلیاں تھمی۔ اُس نے کچھ حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

""میں نے کچھ ذاتی مسائل کی وجہ سے گھر چھوڑ دیا تھا، میرے ابو مجھ سے اِس بات پر ناراض تھے۔ وہ میرا نام بھی نہیں سننا چاہتے تھے۔ گھر چھوڑنے کے بعد میرے نام پر اکثر پارسل، گورنمنٹ نوٹس اور دیگر چیزیں ابّو کے گھر ہی آتی تھیں۔ وہ ہر ایک کو واپس لوٹاتے تھے۔ مجھے اعتراض نہیں تھا، وہ انکا غصّہ تھا اور وہ حق بجانب تھے۔ پر جس روز تم مجھ سے ملنے آئے، اُس روز جو اُنہوں نے کیا، بلاشبہ اُنکو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پر وہ غصّہ میرے لیے تھا، جو تم پر اُتر گیا۔ مجھے اِس واقعہ کا کوئی علم نہیں تھا، اُنکے انتقال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اُنہوں نے ایسا کیا ہے۔ تم انہیں اِس چیز کے لیے معاف کر دو۔ میرے جانے کے بعد، وہ چڑچڑے ہو گئے تھے، ورنہ وہ ایسے ہرگز نہیں تھے۔"" وہ رکا، خشک لبوں پر زبان پھیری، کسی کو وضاحت دینا سب سے مشکل کام تھا۔ ""اگر میں وہاں ہوتا تو کبھی تمہارے ساتھ ایسا نہ ہونے دیتا۔"" آہستگی سے کہتے اُس نے بہت لمبی چوڑی وضاحت دی تھی، اپنے باپ کا بھرم بھی رکھ لیا تھا، اور اُسے منانے کی کوشش بھی کر لی تھی۔ حالانکہ وہ منانے کے معاملے میں بالکل چور تھا۔ (بشریٰ کی بات الگ تھی!)۔ حسین موبائل رکھ کر اٹھ بیٹھا اور اسے بغور دیکھا۔

''اس کے باوجود بھی میں دوبارہ آیا تھا، تمہارے بھائی سے تمہارا نمبر مانگا تھا پر اُس نے نہیں دیا۔ اپنا نمبر دے کر آیا، اِس اُمید پر کہ شاید تم اپنے رویے کی وضاحت کرو۔ پر تم نے بات تک نہیں کی۔'' اُسکا شکوہ بجا تھا۔

''مجھے بھائی نے تمہارا نمبر دیا تھا۔ تب میں اسلام آباد کے لیے فلائٹ پر جا رہا تھا۔ سوچا تھا پہنچ کر تم سے بات کرونگا، پر وہ کاغذ مجھ سے گم ہو گیا۔'' اُس نے پھر وضاحت دی۔

''بات صرف کاغذ کی نہیں تھی، تم چاہتے تو تم بنا کسی نمبر کے بھی مجھے ڈھونڈ سکتے تھے۔ بہت طریقے تھے مجھ تک پہنچنے کے، اگر تم چاہتے تو۔'' اُسکے شکوے نا ختم ہونے والے تھے۔

''ہاں! پر میں شرمندہ تھا۔ وقت گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اب کوئی وضاحت تمہارا دل صاف نہیں کر سکے گی اور نہ میں اب کوئی وضاحت دے سکوں گا۔'' اُسکے چہرے پر شرمندگی کے آثار واضح تھے۔

''تم بھی تو ڈھونڈ سکتے تھے مجھے۔'' نوید نے اچانک ہی پوچھا۔

''ہاں! ڈھونڈ سکتا تھا۔ پر پہلے جتنی کوششیں کی، اُس پر تم لوگوں کے رویوں سے میرا دل بہت دکھا تھا، اُسکے بعد میں نے صلح کی ساری کوششیں ترک کر دیں۔'' اُس نے صاف گوئی سے کہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

''تم کل اپنے بچوں سے بات کر سکتے ہو۔'' اُس نے موضوع بدلا۔

''میں نے سن لیا تھا نیچے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر سے بیزار ہوا۔

''میں نے تمہیں کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔ اُسکے لیے بھی معذرت چاہتا ہوں۔'' اُس نے ایک بار پھر کہا۔

''پورے چھے دن بعد تم نے اُس بات کے لیے مجھ سے معذرت کر ہی لی۔ شکریہ!'' حسین نے جتایا اور پھر منہ بناتے دوبارہ نیم دراز ہوا۔

''معذرت کر لی نا میں نے!'' اچانک ہی نوید کی تیز آواز گونجی تو اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تو؟'' اُس نے اچھنبے سے پوچھا۔

''تو اپنا منہ سیدھا کرو!'' وہ جھنجھلایا۔ کہہ نہیں پا رہا تھا کہ تم اتنے خاموش اور سنجیدہ اچھے نہیں لگ رہے، پر کیا کریں؟ اِس آدمی کو کہنا ہی تو نہیں آتا تھا۔ حسین نے بیساختہ اُمڈتی مسکراہٹ کو چہرے پر ہی روکا۔

''تم نے معذرت کی اور میں نے سن لی، ضروری تو نہیں کہ میں فوراً قبول بھی کروں؟'' اُس نے مزے سے کہتے دوبارہ موبائل کھول لیا۔ نوید نے سر جھٹکتے پاؤں بستر کے اوپر کیے اور اپنا لیپٹ ٹاپ کھول کر پیروں پر رکھ لیا۔ حسین نے چہرہ موڑ کر ایک نظر اُسے دیکھا پھر میز پر پڑی اُسکی گھڑی کو۔

''تمہیں کب سے رسٹ واچ (کلائی پر باندھنے والی گھڑی) کا شوق ہو گیا۔'' حسین نے پوچھا۔

''ٹائم دیکھنا ہوتا ہے۔'' اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''وہ تو موبائل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔'' حسین صاحب اپنی جون میں واپس آ چکے تھے۔

''موبائل میں ہر وقت ہاتھ میں رکھ کر نہیں گھومتا۔'' اُس نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹائے بنا ہی جواب دیا۔

''یہی بات۔۔۔ یہی بات ہم تمہیں یونیورسٹی میں بھی کہا کرتے تھے، جب کہ اسمارٹ فون کا زمانہ بھی نہ تھا۔ پر تم تب بھی گھڑیاں نہیں پہنتے تھے کہ تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اب وقت کی قدر ہو گئی؟'' اُس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو لیپ ٹاپ پر حرکت کرتی، نوید کی اُنگلیاں تھمی۔ اُس نے مڑ کر حسین کو، پھر گھڑی کو دیکھا۔ چہرے پر نہ سختی تھی، نہ سنجیدگی، آنکھوں میں کچھ بے نام سا تاثر تھا۔

''میرا بیٹا کھیلتا تھا میری گھڑی سے۔'' اُسکی آہستہ آواز پر حسین کی مسکراہٹ سمٹی۔

''جب کبھی میں رسٹ واچ کے بغیر اُسے گود میں لیتا تھا تو وہ میرے ہاتھوں میں ڈھونڈتا تھا۔ اِس لیے پہنے رہتا ہوں۔'' اُس نے نرمی سے کہتے گھڑی سے نگاہیں ہٹائی، اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا۔ حسین ہل بھی نہ سکا۔ دل عجیب طرح سے ڈوبا تھا۔ وہ تو اپنے بچوں کو یاد کر کے اُنکی تصویریں دیکھ کر یہ سوچ لیا کرتا تھا کہ ابھی وہ سو رہے ہونگے، ابھی کھیل رہے ہونگے اور ابھی کھانا کھا رہے ہوں گے۔ اُسے تو کل کا انتظار تھا تاکہ وہ اپنے بچوں کی آوازیں سن سکے۔ پر نوید؟ اُسکے پاس تو سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، اُسکی زندگی میں تو ایسا کوئی کل

نہیں آنے والا تھا۔ یاد کرنے کے لیے کوئی اچھی یاد بھی نہیں! سننے کے لیے کوئی آواز بھی نہیں! اور وہ سوچتے تھے کہ نوید کیوں بدل گیا ہے؟

نوید لب بھینچے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ پر ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی معصوم سی آواز گونج رہی تھی۔ آنکھوں میں روشن آنکھوں والا وہ چہرہ گھوم رہا تھا۔ کوئی اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُسکی خالی کلائی پر مار رہا تھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔

''دیکھو بشریٰ! یہ میری گھڑی ڈھونڈ رہا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بشریٰ کو بتا رہا تھا۔ معید نے بڑی بڑی روشن آنکھیں اٹھا کر اُسکو دیکھا۔ پھر اپنے لب سکیڑ کر کچھ الفاظ ادا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''بب۔۔۔ با۔۔۔ با۔۔۔ بّ۔۔ با'' وہ اُسے بابا بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوید مسکرا کر اُسے دیکھ رہا تھا۔

منظر بدلنے لگا، لیپ ٹاپ پر کوئی نوٹیفکیشن بجی تو وہ حال میں واپس آیا۔ حسین ابھی تک اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آج اُس نے وضاحت دی تھی، اُس نے معذرت کی تھی، پھر اُس نے کچھ دکھوں کا اظہار بھی کیا تھا۔ وہ آج کچھ کچھ بدلنے لگا تھا۔ خول چٹخنے لگا تھا، یا شاید ٹوٹنے لگا تھا۔

واپسی کی منزل کے مسافر۔۔۔

اپنے اس دوست کو واپس لانے میں کامیاب ہو رہے تھے۔۔۔

خود پر حسین کی نظریں محسوس کرتا نوید سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گیا۔ پر اُن ننھے قدموں کی چاپ کو کیسے نظر انداز کرتا جو ہر طرف سنائی دے رہی تھیں۔ اُن آوازوں کو کیسے جھٹکتا جو ذہن میں گونج رہی تھیں۔

''باب۔۔۔ با۔۔۔ بابا!''

----------+---------+--------

''تم نے زندگی میں کیا ہی کیا ہے، سوائے ڈرامے بازیوں کے؟ ایک پراٹھا نہیں بیلا جا رہا تم سے؟'' صبح صبح باورچی خانے میں جیسے طوفان آ گیا تھا۔ مقدّم کاؤنٹر پر ہاتھ جمائے، پراٹھے بیلتے حسین کو لتاڑ رہا تھا، جس پر پراٹھے بیلنے کا حکم رضا نے زبردستی تھوپا تھا۔

''تم کرلونا آکر، کھڑے ہو کر بک بک کرنے کی بجائے۔ ''وہ اچھا خاصا جھنجھلایا ہوا تھا۔ صبح صبح بچوں سے بات کر کے، حور عین کو اپنی خیر خیریت پہنچا کر جو موڈ خوشگوار ہوا تھا،اُسے اب یہ چاروں مل کر برباد کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔

''میں کیوں کروں؟کام تمہارا ہے نا؟''

''تو جیسا مل رہا ہے نا،ویسا ہی کھاؤ صبر وشکر کے ساتھ۔ جانا اس نے پیٹ میں ہی ہے۔''

''پھوہڑ ہونے کی یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی؟ ''چائے کی کیتلی میں پانی رکھتے علی نے کہا۔اُسکی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر وہ لوگ اُسکی مدد کرنے کھڑے تھے۔

''تم تو جیسے بڑے سگھڑ ہو۔اپنا آملیٹ دیکھا تھا،سالن جتنے بڑے پیاز تھے اُس میں۔''رضا پر جواب دینا واجب تھا۔

''دیکھو آج میں تم سب کو ایک بات بتا رہا ہوں۔اگر یہ میرے ہاتھوں مر مرا جائے تو مجھ سے شکایت مت کرنا۔''علی نے اُن سب کو مخاطب کر کے کہا۔اشارہ روایتی حریف کی جانب تھا۔

''میں بالکل شکایت نہیں کروں گا۔''حسین نے سب سے پہلے جواب دیا۔

''تم فلحال پراٹھے بنانے پر توجہ دو، گیس جانے کا وقت شروع ہو جاتا ہے یہاں۔''رضا نے علی کو نظر انداز کر کے اُسے کہا۔

''نوید کہاں ہے؟''عمر نے پوچھا۔

''روز کی طرح جاگنگ کر کے غائب ہو گیا۔''مقدّم نے جواب دیا۔

''یہ کہاں گیا ہوتا ہے؟اِس سے کوئی سوال کیوں نہیں کرتا؟''حسین نے پوچھا۔

''تم کر لینا آج!''ماچس کی ڈبیا اٹھا کر،کاؤنٹر سے دور ہٹتے،باغیچے کا دروازے کھولتے رضا نے کہا۔

''تم پھر سگریٹ پینے جا رہے ہو؟''مقدّم کا صرف ایک ہی کام تھا،دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنا اور وہ یہ کام بخوبی سرانجام دے رہا تھا۔

''ہاں!''اُس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے سکون سے کہا۔

''ناشتے سے پہلے سگریٹ، ناشتے کے بعد سگریٹ، سونے سے پہلے، جاگنے کے بعد، رات کے کھانے سے پہلے پھر اُسکے بعد۔۔۔کسی وقت تو چھوڑ دو اِس خراب چیز کو۔'' پیاز کاٹتے عمر نے تاسف سے کہا۔

''یار! تم لوگ تھوڑا آہستہ بولو، میرے سر میں درد ہو رہا ہے بہت۔'' چائے کی پیالیاں ٹرے میں سجاتے علی نے چڑ کر کہا۔

''تمہارے سر کا درد جا کیوں نہیں رہا؟'' عمر کو تشویش ہوئی۔

''پتہ نہیں! بار بار اٹھ رہا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''میں نے تو سگریٹ آفر بھی کی تھی، تم نے ہی منع کر دیا۔'' دروازے کے باہر کھڑے رضا نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

''سر درد کا سگریٹ سے کیا تعلق ہے؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تعلق ہے۔'' وہ ٹریک کے پاس رکھے ڈسٹ بن میں سگریٹ کا بچا حصّہ ڈالتے ہوئے واپس اندر آیا۔

''دیکھو! جب میں اپنے شوق کے لیے نشہ کرتا تھا، تب میں اُسکا بہت عادی ہو گیا تھا۔'' اُس نے بات شروع کی، تو علی نے لب بھینچ کر، اور باقی سب نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''کیا تم اپنی بکواس بند کر سکتے ہو؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ارے سنو تو!'' وہ پاس رکھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھا۔ ''میں نے جب نشہ چھوڑا تو وہ اتنا آسان کام نہیں تھا، اُسکے ٹھیک ٹھاک سائیڈ ایفیکٹس تھے۔ جیسے تم سر درد کا شور مچا رہے ہو، ایسے میں پورے جسم میں درد کا شور مچاتا تھا۔ اب سگریٹ بھی ایک قسم کا نشہ ہی تو ہے۔ اور اُسے پینے والا نشئی! تم نے اِسے اچانک سے چھوڑ دیا ہے تو سر میں درد ہونا تو بنتا ہی ہے نا! ایک چیز کی تمہارے جسم کو عادت ہے، اب اسے اچانک ہی چھوڑ دو گے، تو اسکے اثرات تو آئینگے ہی۔ اس لیے ایسی چیزوں کو اچانک سے چھوڑنے کے بجائے آہستہ آہستہ کم کرنا چاہیے یا عارضی طور پر کوئی متبادل ڈھونڈ لینا چاہیے، جو ایڈیکٹو نہ ہو۔ میں اپنے تجربے سے بتا رہا ہوں۔ اب میری طرح تم اپنے شوق کے لیے تھوڑی سگریٹ پیتے تھے، لہٰذا تم تھوڑا بہت مقدار کم کر کے پیو تو سر درد کچھ بہتر ہو سکتا ہے۔ یا کوئی متبادل ڈھونڈ لو!'' رضا نے بڑے

مزے سے اپنا تجربہ اسے سنایا تھا، پر وہ بالکل متاثر نظر نہیں آرہا تھا۔ جبکہ حسین اور مقدّم ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ وہ کوئی موقع نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''تم سے بات کرنا دنیا کا انتہائی فضول کام ہے۔'' علی نے سنجیدگی سے اُسکی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اور فضول آدمی فضول کام ہی کرتا ہے۔'' اُس نے حساب برابر کیا تو علی سر جھٹکتے واپس چائے کی ٹرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ باقی تینوں اب تک ہنس رہے تھے۔

----------+---------+--------

رات کا آخری پہر تھا، عمر کی آنکھ کھلی تو پیاس کا احساس شدت سے جاگا۔ وہ اُٹھ بیٹھا، میز پر نظر پڑی تو جگ خالی ہو چکا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور پانی کا جگ لیکر باہر راہداری میں آ گیا۔ حویلی خاموش پڑی تھی۔ وہ بھی ریلنگ پر آیا اور نیچے ہال میں جھانکا۔ ہال کی دھیمی لائٹیں جلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ میں خالی جگ تھامے دوسرے ہاتھ سے جمائی روکتا وہ بائیں طرف والی سیڑھیوں سے اُترتا نیچے آنے لگا۔ نیم اندھیرے ہال کی محرابی کھڑکیوں سے چاند کی روشنی اندر آرہی تھی۔ ابھی وہ آخری سیڑھی پر ہی تھا کہ اُسے محرابی کھڑکی کے شیشے کے باہر کوئی وجود کھڑا محسوس ہوا۔ اُسکے قدم منجمد ہوئے۔ اُس نے رک کر بغور دیکھا تو کوئی سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے فوراً ہٹا۔ عمر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اُسکا وہم ہرگز نہیں تھا۔ اُس نے میکانکی انداز میں دروازے کی طرف دیکھا۔ نوید سارے دروازے سونے سے پہلے اندر سے بند کر دیا کرتا تھا۔ وہ اب بھی بند تھے۔ عمر اُلٹے قدموں واپس پلٹا اور تیزی سے اوپر آیا۔ راہداری میں پہلا کمرہ اُسکا ہی تھا۔ پر وہ سیدھا آخری کمرے تک آیا اور دروازہ بجایا۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ جہاں نوید ہاتھ میں خالی جگ پکڑے کھڑے عمر کو دیکھ کر حیران ہوا تھا، وہیں عمر بھی اُسے ہاتھ میں گن تھامے دیکھ کر ساکت ہوا تھا۔ پیچھے حسین بھی کچھ سوئی جاگی کیفیت میں بیٹھا نا سمجھی سے اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''وہ۔۔۔مجھے لگا۔۔۔جیسے میں نے حویلی کے باہر کسی کو دیکھا ہے۔'' اُس نے نوید کو پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

''تمہیں ایسا لگا نہیں ہے، بلکہ حویلی کے احاطے میں واقعی کوئی ہے۔ اکرم کو میں نے فون کر کے پوچھا ہے پر وہ انیکسی میں ہی ہے۔ حسین کو میں نے اٹھا دیا ہے، تم باقی سب کو جگاؤ اور ہال نمبر دو میں جمع کرو۔ میں حویلی کے باہر دیکھتا ہوں۔ جلدی!'' وہ اُسے تفصیلاً بتاتا باہر نکلا۔ عمر

نے خالی جگ وہیں چھوڑا اور تیزی سے دوسرے کمرے کی جانب بڑھا، حسین بھی اُٹھ کر باہر آیا۔ پیچھے نوید کے لیپ ٹاپ پر سی سی ٹی وی کا منظر واضح ہو رہا تھا۔ جہاں حویلی کے احاطے میں کوئی بنا چاپ پیدا کیے سیاہ لباس میں سیاہ پی کیپ پہنے ایک ایک کھڑکی چیک کر رہا تھا۔

دوسری جانب نوید ہال کے بجائے باورچی خانے میں آیا اور وہاں موجود باغیچے کا دروازہ کھول کر بنا چاپ کے قدم اٹھاتا باہر نکلا۔ وہ اجنبی شخص نوید کے سامنے تھا، اور نوید اُسکے پیچھے۔ وہ نوید کی آمد سے بے خبر ایک ایک کھڑکی چیک کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ نوید نے اُسکی پیٹھ کا نشانہ لیکر گن تان لی۔

"ہلنامت! ورنہ جان سے مار دونگا۔" نوید کی خوفناک حد تک سرد آواز فضا میں گونجی تو سامنے والا وجود جھٹکا کھا کر مڑا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اُس نے اپنا گن والا ہاتھ نوید پر تان لیا۔ یہ اُسکا فوری دفاع تھا۔

چاند کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح ہوا تو ٹریگر پر انگلی رکھے نوید عالم نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

"تم؟" اُس کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

"کیوں ڈر گئے مجھے دیکھ کر؟" پی کیپ کے نیچے چہرہ مسکرایا تھا۔ گن دونوں نے اب بھی ایک دوسرے پر تان رکھی تھیں۔

ایک حیران تھا

اور دوسرا محظوظ!

--------+---------+----------

(جاری ہے)

نحل کی قسط نمبر اٹھارہ آپ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو میری پیج اور ویبسائٹ پر پڑھ سکے گی۔ ان شاءاللہ